آدابِ معاشرت

از : افادات حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۵۔ اگر کسی کی بیوی سے کوئی واقعی تکلیف اور رنج اس شخص کے والدین کو نہ پہونچتا ہو خواہ مخواہ والدین اس شخص کو حکم کریں کہ تو اپنی عورت کو طلاق دیدے، اس کہنے کی تعمیل اس آدمی پر ضروری نہیں بلکہ اس صورت میں طلاق دینا عورت پر ایک طرح کا ظلم کرنا ہے، طلاق اللہ پاک کے نزدیک بڑی بری چیز ہے۔ فقط مجبوری میں جائز رکھی گئی ہے۔ خواہ مخواہ طلاق دینا ظلم اور مکروہ تحریمی ہے۔ نکاح تو وصال کے لئے موضوع ہے یہ فراق بلا وجہ کیسے روا ہو سکتا ہے۔ امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں اسکی تفصیل بیان کی ہے۔

۶۔ اگر والدین کسی گناہ کا حکم دیں کہ فلاں گناہ کرو مثلاً فرمائیں کہ اہل حق کی مدد نہ کرو یا زکوٰۃ نہ دو یا دینی تعلیم نہ کرو یا اور کوئی ایسی ہی بات کا حکم دیں تو اس صورت میں ان کا کہنا ماننا حرام ہے اور ان کی مخالفت فرض ہے جب کہ وہ کام ضروری ہو جس سے وہ روکتے ہیں ہاں اگر ان کو کوئی تکلیف ہو مثلاً وہ بیمار ہوں اور کوئی خادم نہ ہو اور نماز کا وقت ہے اگر ان کی خبر گیری نہ کی جائے تو سخت تکلیف کا اندیشہ ہے پس ایسی صورت میں اگر وہ نماز قضا کرنے کو کہیں تو قضا کر دے، پھر کسی وقت قضا پڑھ لے اور اگر کسی مستحب کام سے روکیں اور اپنی کسی ضروری حاجت کی وجہ سے روکیں تو ان کے حکم کی تعمیل واجب ہے۔ اور خواہ مخواہ روکیں تو واجب نہیں ہے۔

۷۔ اگر والدین کہیں کہ تم ہماری فلانی اولاد کو کہ وہ صاحب حاجت نہیں ہے، اس قدر رقم دے دو تو باوجود گنجائش کے بھی یہ رقم دینا واجب نہیں یہاں تک مع نظائر یہ بیان ہو گیا کہ کس کس جگہ والدین کے حکم کی تعمیل واجب اور کس مقام پر منع ہے۔ اور کس مقام پر واجب ہے۔ غرض ہر جگہ اطاعت والدین ضروری نہیں۔

والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا صحیح مطلب

جس حدیث میں ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرنا افضل ہے نماز سے اور روزہ سے اور حج سے اور عمرہ سے اور جہاد سے راہِ خدا میں یہ حدیث ثابت نہیں اس لئے قابل اعتبار نہیں اور اس کو حدیث کہنا روا نہیں، جیسا کہ امام شوکانیؒ نے نقل کیا ہے فوائد مجموعہ میں اور قاعدۂ شرعی کے خلاف ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

مشکوٰۃ باب البر والصلہ میں بزبانیت ترمذی مذکور ہے رضائے پروردگار رضائے والدین میں ہے یعنی والدین اگر راضی رہیں تو اللہ تعالیٰ بھی راضی رہے اور وہ ناراض رہیں تو خدا بھی ناراض اور ناخوشی پروردگار کی ناخوشی والدین میں ہے۔

فے یہاں سے وہم پیدا ہوتا ہے کہ ہر کام والدین کی رضا پر لازم ہے۔ ورنہ گناہ ہوگا حالانکہ یہ حکم نہیں پس مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جن امور میں اطاعت والدین شریعت سے لازم ہے ان امور میں اگر کوتاہی کرے گا تو ناراضی حق حاصل ہوگی۔ اور نافرمان جب ہی ہوگا جب کہ حقوق ضروریہ ادا نہ کرے پس یہ حکم مطلقاً نہیں بلکہ داخل ہے اس قاعدۂ کلیہ میں جو ابتداً قائم کیا گیا ہے۔ کہ جس بات کے کرنے سے والدین کو تکلیف ہو وہ کام نہ کرنا واجب ہے اور اس حدیث کا شان نزول خصوصیت بیان حقوق والدین اور مراد مذکور پر دلالت کرتا ہے جس کو اشتہار التفات میں نقل کیا ہے اور راز یہ ہے کہ ہر امر میں اطاعت کا حکم دیا جاتا اور اسی طرح عورت کو ہر امر میں خاوند کی اطاعت کا حکم ہوتا تو بہت سے لوگ عبادت الٰہی سے جو پیدائش انسان سے اصلی مقصود ہے محروم ہو جاتے اور اپنے اصلی محبوب کی یاد سے اور اس کے ذکر سے حقیقی لذت اور کمالات عالیہ سے محروم رہتے۔ جس کے بغیر طالب خالق اکبر کو چین ہی نہیں اور مقصود بھی وہی ہے جیسا کہ تمہید میں بیان کر چکا ہوں۔

انسانی پیدائش کا اصل مقصد

قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۵

اور ہم نے جن و انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اور حدیث قدسی جو باعتبار سند ضعیف مگر ہمارے مقصود کو غیر مضر اور باعتبار تحقیق حضرات اہل کشف صحیح ہے اسی مضمون کو بتلاتی ہے اور وہ یہ ہے۔

کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق۔

میں خزانہ پوشیدہ تھا پس میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں سر پیدا کیا میں نے مخلوق کو، پس معلوم ہوا کہ عبادت الٰہی اور معرفت محبوب حقیقی مقصود ہے پیدائش مخلوق سے پس ہر جگہ مقدم رکھا جائے گا۔

(انتخاب: ڈاکٹر ہارون رشید صاحب)

سوال و جواب

— محمد طارق ندوی

سوال مچھلی کا خون اگر کپڑوں میں لگ جائے تو کپڑا ناپاک ہوگا یا نہیں؟

جواب مچھلی کا خون اگر کپڑوں میں لگ جائے تب بھی کپڑا پاک رہے گا ناپاک نہ ہوگا۔ مچھلی میں خون نہیں ہوتا ہے وہ سرخ رنگ کی رطوبت ہے۔

سوال زوال سے پہلے دی ہوئی اذان معتبر ہے یا نہیں۔

جواب نماز جمعہ کا وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے اس لئے زوال سے پہلے جمعہ کی اذان دینا درست نہیں ہے، اگر کسی نے زوال سے پہلے اذان دیدی تو زوال کے بعد دوبارہ اذان دینا ضروری ہے۔

سوال کیا کلمات اذان و اقامت کے درمیان چل سکتے ہیں۔

جواب اذان و اقامت ایک ہی جگہ ٹھہر کر کہنی چاہئے۔ درمیان میں چلنا خلاف اولیٰ ہے، کرہ مشیہ فی ۲ اقامتہ (درمختار مع شامی ص ۲۶۵ ج ۱)

سوال مسجد میں پینٹ کا استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اگر پینٹ میں بدبو نہ ہو تو اسکا استعمال مسجدوں میں کیا جا سکتا ہے

سوال جس چیز پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھا ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ ہوتی ہے یا نہیں

جواب جہاں تک سونے یا چاندی کے چڑھے ہوئے اپلے پانی کی بات ہے جو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تو اس پر زکوٰۃ نہیں واجب ہوگی چونکہ وہ تو محض ایک رنگ ہے۔ سونا اور چاندی نہیں ہے۔

سوال کیا یہ مستحب ہے کہ میت کو وہیں دفن کیا جائے جہاں موت ہوئی ہے؟

جواب ہاں، یہ مستحب ہے کہ میت کو وہیں دفن کیا جاوے جہاں موت واقع ہوئی ہے۔

سوال اگر والد اپنے نابالغ بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کر دے اور قبضہ اپنا ہی رکھے تو ہبہ معتبر ہوگا یا نہیں؟

جواب والد کے صرف ہبہ کر دینے سے ہبہ معتبر ہو جائے گا والد کا قبضہ نابالغ اولاد کے حق میں معتبر ہے

واذا وھب الاب لابنہ الصغیر ھبۃ ملکھا الابن بالعقد

(ھدایہ جلد ثالث صفحہ ۲۴۱)

سوال ایک شخص نے ہبہ کیا پھر موہوب کا انتقال ہو گیا تو کیا اس کے ورثاء سے واہب ہبہ واپس لے سکتا ہے

جواب نہیں، کیونکہ واہب یا موہوب دونوں میں سے کسی ایک کے انتقال کے بعد ہبہ واپس نہیں لیا جا سکتا ہے۔

سوال شوہر بیوی کو ہبہ کرنے کے بعد ہبہ واپس لے سکتا ہے؟

جواب نہیں، شوہر بیوی یا بیوی شوہر کو ہبہ کرنے کے بعد واپس نہیں لے سکتے ہیں۔

• • • • •

تعمیر حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ

مجلس صحافت و نشریات۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۲۷ | ۲۵ جنوری ۱۹۹۰ء مطابق ۲۶ جمادی الآخر ۱۴۱۰ھ | شمارہ ۶

مجلس ادارت

شمس الحق ندوی
محمود الازہار ندوی

خط و کتابت کا پتہ

منیجر "تعمیر حیات" پوسٹ بکس ۹۲
ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ انڈیا

زر تعاون

سالانہ	پچاس روپے
ششماہی	چالیس روپے
فی شمارہ	۲/۲۵ روپے

بیرون ملک

بحری ڈاک، جملہ ڈاک ۱۰ ڈالر

فضائی ڈاک

ایشیائی ممالک	۲۵ ڈالر
افریقی ممالک	۲۵ ڈالر
یورپ ممالک	۲۵ ڈالر
امریکی ممالک	۲۵ ڈالر

نوٹ

ڈرافٹ سکریٹری مجلس صحافت و نشریات لکھنؤ کے نام سے بنائیں اور دفتر "تعمیر حیات" کے پتہ پر روانہ فرمائیں

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپکا چندہ ختم ہو چکا ہے لہذا آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا یہ خادم مدرسہ اسلام کا ترجمان آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو سالانہ چندہ مبلغ پچاس ۵۰ روپئے ارسال فرمائیے۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا خریدار نمبر لکھنا نہ بھولیں۔

شمس الحق ندوی

اس پر کوئی احتجاج نہیں کرتا

ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے، یہاں حکومت کی تشکیل عوام کے منتخب کردہ نمائندوں پر ہوتی ہے جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آزادیٔ رائے ہر ایک کو حاصل ہے۔ عوام حکومت سے اپنے حقوق کے لئے مطالبہ کا حق رکھتے ہیں، اپنی شکایات کا بے خوف و خطر حکومت سے اظہار کر سکتے ہیں، حکومت ان کے مطالبات ماننے پر مجبور ہوگی، ورنہ وہ حکومت جمہوری حکومت نہ کہلائے گی، بلکہ جمہوریت کے نام سے چند ہوشیار و مفاد پرست لوگوں کی حکومت کہلائے گی۔

لیکن حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ اس طرح کرنا اور ایسا طریقۂ کار اپنانا کہ جس سے حکومت کا نہیں بلکہ خود جمہور ہی کا نقصان ہو، یہ طریقۂ احتجاج و مطالبہ سمجھ میں نہیں آتا اور یہ تو اور بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت کے پاس اس کے لئے کوئی قانون و ضابطہ نہ ہو کہ جمہوریت میں جمہور جب چاہیں کوئی بھی مسئلہ کھڑا کر کے لوٹ، مار، توڑ پھوڑ شروع کر دیں، مطالبہ اور اظہار ناراضگی تو کریں حکومت سے اور نقصان پہنچائیں جمہور کو اس طرح کہ جو لوگ ان کے کہنے پر دکان نہ بند کریں، ان کو مارنا اور دکان کو لوٹنا اور جلانا شروع کر دیں، بسوں، کاروں اور دیگر سواریوں کو جلانا، پھونکنا شروع کر دیں، سرکاری اور غیر سرکاری بسوں پر پتھراؤ شروع کر دیں، جمہوریت کے مارے ہوئے ان جمہور کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بس کے مسافر حکومت کے لوگ ہیں یا جمہور، چوٹ جمہور کو آ رہی ہے یا حکم انوں کو۔ ٹرین روک دی، اس پر کون لوگ سوار ہیں، جمہور یا ارباب حکومت کوئی کسی جاں بلب بیمار کے لئے دوا لئے جا رہا ہے، گاڑی روک دی گئی وہ کیسے پہنچے، ٹرین پر مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے کمزور و بیمار ہر طرح کے لوگ سوار ہیں، کسی اہم اور ضروری کام سے جا رہے ہیں، جلد اور وقت پر پہنچنا ہے۔ مگر ان عوام کا قافیہ خود عوام تنگ کئے ہوئے ہیں، یہ کون سی جمہوریت ہے۔ اور حکومت ہے کہ بے بس ہے، کوئی ایسا مؤثر اقدام نہیں کر سکتی جو آئندہ ایسا کرنے پر روک لگا سکے

کیا عوام پر عوام کو حملہ آور ہونے لوٹ مارنے کی آزادی کا نام جمہوریت ہے، حد ہے کہ دانش گاہوں کے ان طالب علموں پر بھی یہ دورہ پڑتا ہے جو کل حکومت کی کرسیوں اور اس کے انتظامیہ اور ملک کی مشنری چلانے والے ہوں گے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ بات خلاف عقل ہے کہ عوام حکومت کا غصہ عوام پر اتاریں، اپنے ہاتھوں اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچائیں وہ چیز جو حکومت کی سمجھی جاتی ہیں وہ حکومت کی نہیں ملک کے عوام کے ہی ہیں پر لگائے گئے مختلف قسم کے ٹیکسوں سے وہ تیار ہوئی ہیں۔ اور ان سے فائدہ بھی ایک اصول کے تحت عوام ہی اٹھاتے ہیں۔ لہذا جو کچھ جلایا پھونکا جاتا ہے وہ حکومت کا نہیں بلکہ عوام ہی کا ہوتا ہے۔ ٹرین جلے گی ریلوے کا نقصان ہوگا، کرایہ بڑھا کر عوام ہی سے وصول کیا جائے گا بسیں جلائی جائیں گی بجلی کے کھمبے اور بلب توڑے جائیں، عوام سے وصول کیا جائے گا، جرمانہ لگا کر نہیں بلکہ کرایہ اور ٹیکس کی شکل میں اتنی کھلی اور عام بات بھی جب ہمارے عوام نہیں سمجھتے تو وہ اپنا حق رائے دہی اور ووٹ کتنا صحیح استعمال کر سکتے ہوں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس تعلیم و ترقی کے دور میں کسی ملک کے عوام اتنے نادان ہوں۔ یہ بات ماورائے عقل و فہم ہے۔

یہ دردناک و افسوسناک المیہ ملک و قوم کو تباہی کی طرف لے جانے والی یہ بھیانک صورت حال جو اکثر و بیشتر ہوش و حواس گم کر دینے والے ہولناک فساد کی شکل میں بھی ہوتی رہتی ہے۔ اگر اس کی تہ میں جایا جائے اور حقیقت پسندی کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب خواص کا کھیل ہے، یہ ان لوگوں کا کھیل ہے جو گلا پھاڑ پھاڑ کر ملک کو ترقی دینے، ملک سے غریبی دور کرنے، ملک کے اندر امن و امان پھیلانے کی آواز لگاتے رہتے ہیں۔

ہوتا ہے کہ الیکشن کے بعد جب ایک پارٹی برسر اقتدار آجاتی ہے تو اس کی شہزادگی کی شان دیکھ کر دوسری پارٹی کے لوگوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اب انکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کو بدنام کریں اور اس کی حکومت کو گرانے کے لئے مختلف ناموں اور عنوانوں سے اسٹرائک، ہڑتال اور چکا جام کیا جائے، معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر افواہ پھیلا کر آگ و خون کا کھیل کھیلا جائے تاکہ حکومت گرے یا اگر اپنی پانچ سالہ مدت کسی طرح پوری بھی کرلے تو عوام اتنے بیزار ہو چکے ہوں کہ اس کو ووٹ نہ دیں۔ تحقیق کی جائے اور تہ میں جایا جائے تو یہ بھی پتہ چلے گا کہ فساد و ہنگامہ آرائی کا کام خود کبھی برسر اقتدار پارٹی کراتی ہے تاکہ پٹ پٹا جانے کے بعد زبانی جمع خرچ کے ذریعہ ان پٹنے والوں سے ہمدردی کا مظاہرہ کرکے یہ باور کرائے کہ تمہاری حفاظت و نگرانی ہمیں کر سکتے ہیں، یہ فساد فلاں فلاں پارٹیوں نے کرایا ہے۔ دیکھو ان کو بھول کر بھی ووٹ نہ دینا کہ اگر کہیں انکو حکومت مل گئی تو پھر تمہاری خیر نہیں۔

کوئی صاحب عقل و فہم یہ بتلائے کہ جمہوریت کے نام پر جب کسی ملک کے خواص ہاتھ کی اس صفائی کے ساتھ یہ سارے گھناؤنے کھیل کھیلنے لگیں جن کا اوپر تذکرہ ہوا تو اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا؟ مگر اس کے خلاف ہمارے ملک میں کوئی احتجاج نہیں ہوتا جیسے ہمارا ملک بالکل ہی دیوالیہ ہو چکا ہے، اور مثبت و انسانیت دوستی کے انداز سے سوچنے والے لوگ یہاں پائے ہی نہیں جاتے کہ وہ ان تخریبی احتجاجوں کے خلاف احتجاج کریں، اور لوگوں کو یاد دلائیں کہ یہ راستہ تباہی و ہلاکت کا راستہ ہے آگ و خون کا یہ کھیل ملک و قوم کو تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف لے جارہا ہے، جمہوریت اچھی چیز ہے لیکن اس کا کوئی اصول تو ہو، عوام کس صلاحیت و لیاقت کا نمائندہ منتخب کریں اس کی علمی صلاحیت، اخلاقی معیار کیا ہونا چاہیئے۔ اگر یہ نہیں تو اقبال مرحوم کے بقول: ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس وقت بندوں کو گننے ہی والی جمہوریت چل رہی ہے۔ یہ گننے والی جمہوریت ان ساری خرابیوں کا مجموعہ ہوگی جن کا اوپر ذکر ہوا۔

اگر جمہوریت میں بندوں کو تولنے والے اصول پر نہ غور کیا گیا اور اس کو اپنایا نہ گیا تو یہ نظام بد سے بدتر ہوتا جائے گا اور ملک کا بگڑا ہوا ڈھانچہ درست نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اس کی فکر کرنی چاہیئے اور یہ کام ملک کے سنجیدہ پڑھے لکھے، تعمیری انداز سے سوچنے والے طبقہ کا ہے کہ وہ میدان میں آئے اور اس طرح کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

ازبکستان کے مذہب پسند عوام کی زندگی میں عظیم تبدیلیاں

ترجمہ: ممتاز اعظمی

مفتی محمد صادق صدر ایشیا و ازبکستان نے کہا ہے کہ:

"مذہب کے سلسلے میں سوویت یونین کی کمیونسٹ حکومت کے موقف میں نسبتاً رواداری اور لچک نیز جمہوری اقدار کی بحالی کے نتیجے میں وہاں مسلمانوں سمیت دوسرے تمام مذاہب کے معتقدین کی زندگیوں میں نمایاں تبدیلی آئی ہے موصوف کے کہنے کے مطابق روسی نظام حکومت میں جمہوری تبدیلی اور وسیع النظری ہی کا نتیجہ ہے کہ سوویت یونین میں پہلی مرتبہ چند مسلمانوں سمیت کچھ مذہب پسند شخصیتیں ملکی قانون ساز مجلس اعلیٰ کی ممبر منتخب ہو سکی ہیں۔

سوویت یونین میں بہت سی اسلامی عبادتگاہیں اور خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کا قرآن، جو ایک گراں مایہ اسلامی یادگار ہے مسلمانوں کے حوالے کرنا جہاں روسی قیادت کی دانشمندی اور وسیع المشربی کا ثبوت فراہم کرتا ہے وہیں مسلمانوں کے تئیں اسکے خیراندیشانہ نقطۂ نظر کا غماز بھی ہے۔

وہ عمارتیں جو مسلمانوں کے حوالے کی گئی ہیں۔ ان میں کلیان کی عظیم مسجد بھی ہے جس کی تعمیر بخارا شہر میں سولہویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی۔ کئی صدیوں تک یہ وسط ایشیا کی سب سے بڑی مسجد سمجھی جاتی رہی۔ سوویت انقلاب کے وقت یہ مسجد حکومت کے قبض و تصرف میں چلی گئی اور اسے قدیم طرز تعمیر کے نمونے کی یادگار کے بطور محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا اور پھر اس میں کسی طرح کی عبادت کی اجازت نہیں رہی۔

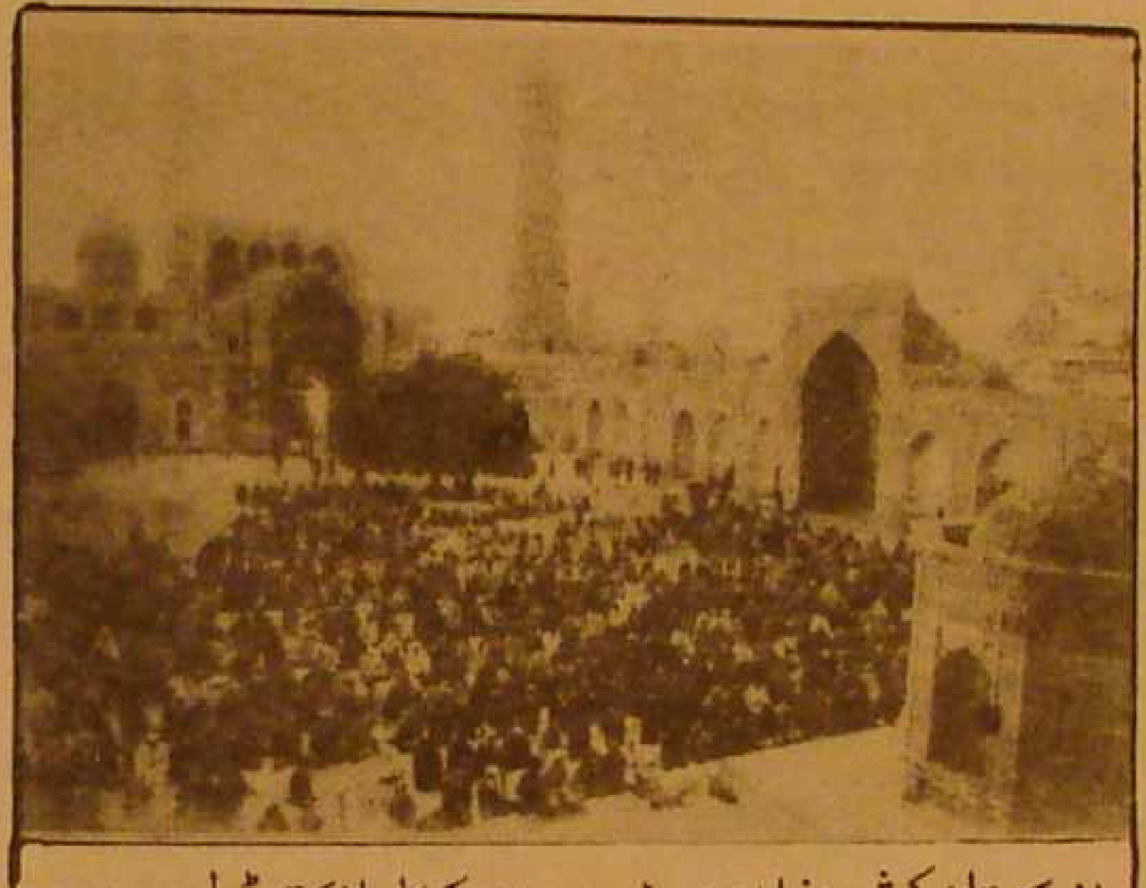

ازبکستان کے شہر بخارا میں سولہویں صدی کی کلیان کیتھیڈرل مسجد میں۔ نماز کا منظر یہ مسجد عرصہ سے بند تھی جسے چند ماہ پہلے روسی حکومت نے مسلمانوں کے حوالے کی

حال میں ازبکستان حکومت کے فیصلے کے مطابق یہ مسجد مسلم بورڈ کے حوالے کر دی گئی ہے۔

اس سال ۶ مئی کو عید الفطر کے مبارک موقع پر سیکڑوں سال کی ویرانی کے بعد اسمیں ہزاروں مسلمانوں نے جوق در جوق جمع ہو کر پورے جوش و خروش کے ساتھ پہلی نماز عید ادا کی، اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اس کے علاوہ دوسری بہت سی عمارتیں جو مسلم بورڈ کے حوالے کی گئی ہیں۔ ان میں بخت دین نامی قدیم عمارت جو بخارا میں ہے، خوقند کے خان حکمرانوں کی مسجد، زنگی عمارت جس کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر مشہور تیمور شہنشاہ ابو عیسیٰ الترمذی نے کی تھی جس کا مقبرہ سورخندایہ کے علاقے میں ہے، وغیرہ عمارتیں شامل ہیں۔ ازبکستان میں نئی مسجدیں جن کے دروازے مسلمانوں پر وا کئے جارہے ہیں ان کی تعداد مسلسل روز افزوں ہے "چند سالوں پہلے وہاں صرف ۸۸ مسجدیں تھیں مگر اس وقت یہ تعداد دو سو سے زائد ہو چکی ہے۔ ساتھ ہی اس بات کے بھی قوی امکانات ہیں کہ حکومت کی جانب سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

ازبکستان میں مسلمانوں کو دینی تعلیم کے زائد مواقع حاصل ہو رہے ہیں اس وقت وہاں دو دینی تعلیمی ادارے ہیں۔

۱۔ میر عرب مدرسہ بخارا
۲۔ امام بخاری اسلامی ادارہ تاشقند

ان دونوں مدرسوں میں پورے سوویت یونین کے مسلم نوجوان تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان دونوں مدرسوں کے فارغ طلباء عرب دنیا کے کئی ممالک مثلاً اردن اور مصر کی یونیورسٹیوں کے شعبۂ شریعت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔

مسلم بورڈ کے پیش نظر یہ منصوبہ بھی ہے کہ غیر ممالک میں رابطہ عالم اسلامی کے وظیفے پر تعلیم حاصل کرنے والے روسی مسلمان طلباء کی تعداد بڑھائی جائے

ساتھ ہی مسلم بورڈ اپنی کتب و رسائل کی اشاعتی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے میں سرگرم عمل ہے۔

بورڈ "مشرقی سوویت یونین کے مسلمان" نامی ایک رسالہ، قمری کلنڈر، نصابی کتب اور مذہبی کتابوں میں شائع کر رہا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری محترم عبداللہ عمر نصیف نے اپنے حالیہ دورۂ تاشقند میں اعلان کیا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

برادر عزیز سید احمد الحسنی مرحوم

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی الحسنی الندوی

اہم خانگی حادثہ (اہلیہ کی وفات) کو (جو ۱۵ دسمبر کو پیش آیا تھا) دو ہی تین دن ہوئے تھے کہ لاہور سے برادران عزیز سید ابراہیم حسنی اور سید اسحاق حسنی سلمہما اللہ تعالیٰ کا تار ملا کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۹ء کو بھائی سید احمد الحسنی نے لاہور میں سفر آخرت اختیار کیا اس اچانک اور اندوہناک خبر نے جو دل و دماغ پر بجلی بن کر گری "غم بالائے غم" کا کام کیا، یہ خبر اس لئے بھی صاعقہ اثر تھی کہ چند ہی دن پہلے راقم نے ان کو بڑے اصرار اور قلبی تقاضے کے ساتھ گھر کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی اور تار بھی بھیجا تھا، وہ خود بھی عرصے ہندوستان آنے اور اپنے عزیزوں اور اہل خاندان سے ملنے کا اشتیاق و ارادہ ظاہر کرتے تھے اور ہم لوگ بھی ان کی آمد کے بے چینی کے ساتھ متمنی اور مشتاق تھے، کئی بار ان کو خطوں میں لکھا تھا کہ تم کو اندازہ نہیں کہ تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں فرحت و مسرت کی کیسی لہر دوڑ جائے گی اور وہ دن ہم سب کے لیے عید سے زیادہ خوشی کا دن ہوگا۔ اس مسرت و اشتیاق کا سبب اور اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے، جب خاندان میں انکی ایک یگانہ حیثیت اور ہم بھائی بہنوں اور ان کے قریب ترین اور قابل افتخار تعلق اور طویل مدت کی یکجائی کا کچھ علم ہو، اس لئے ان کی خصوصیات اور بعض خداداد کمالات کے تذکرہ کے پہلے اس گذرے ہوئے زمانہ اور بیتے ہوئے دنوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور ہمارے حسنی قطبی خاندان میں جس کا اصل مرکز رائے بریلی تھا، اور اس کی ایک شاخ ریاست ٹونک میں مقیم رہی انکے خاندانی امتیاز اور خصوصیت پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

مجاہد اعظم مجدد وقت، داعی الی اللہ اور مصلح کبیر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں (جن میں راقم کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" (۱-۲) اور نامور ادیب و مصنف مولانا غلام رسول مہر، مدیر "انقلاب" لاہور کی بلند پایہ تصنیف سید احمد شہید (۱-۲-۳) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ حضرت کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، دو صاحبزادیاں تھیں جن میں سے ایک کا عقد جن کا نام بی بی سارہ تھا۔ آپ کے حقیقی بھتیجے سید محمد اسماعیل صاحب فرزند برادر حقیقی مولانا سید محمد اسحاق صاحب سے ہوا تھا۔ ان کے ایک فرزند جو حضرت سید صاحب کے نواسہ اور برادر اکبر مولانا سید محمد یعقوب صاحب کے پوتے تھے ان کا نام بھی سید اسحاق تھا بالاکوٹ کے واقعۂ شہادت کے بعد جو ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) میں پیش آیا، حضرت سید صاحب کے اہل خانہ اور افراد خاندان جو اس سے جہاد تک پیر کوٹ ستھانہ[1] میں مقیم تھے، نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ریاست ٹونک (راجپوتانہ) کے اصرار بلیغ بلکہ خوشامد پر ٹونک منتقل ہوئے تو نواب صاحب نے حضرت سید صاحب کے نواسہ اور اہلیہ صاحبہ کے لئے ولی عہد ریاست کے بعد سب سے بڑی جاگیر پیش کی اور جو زیادہ سے زیادہ احترام اور بزرگ داشت ہو سکتی ہے اس کا معاملہ کیا، خود دروازہ پر خادمانہ حاضر ہوتے اور کہتے کہ غلام حاضر ہے کوئی خدمت کوئی کام ہے؟ آخر تک انہوں نے اور بڑی حد تک ان کے جانشینوں نے محبت و عقیدت اور تعظیم و احترام کا یہ معاملہ قائم رکھا، ان افراد خاندان کے ساتھ جو سید صاحب سے قریبی نسبت رکھتے تھے، جماعت مجاہدین کے بچے کھچے افراد اور ان کے متوسلین بھی بالاکوٹ کی شہادت گاہ یا سندھ سے پشاور کے بعض حصوں سے ٹونک منتقل ہو گئے تھے، اور ان کی وجہ سے شہر کا وہ محلہ جہاں انہوں نے سکونت اختیار کی تھی "قافلہ" کہلاتا تھا، اور وہ صحت عقائد، پابندی فرائض، اسلامی اخوت و مساوات، بھائی چارگی، تواضع اور سادگی، دینی حمیت اور شوق جہاد میں امتیاز خاص رکھتا تھا، راقم سطور نے راجپوتانہ میں انجمن تعلیمات دین کے قیام کے موقعہ پر جس کا اس محلہ "قافلہ" سے چند گز کے فاصلہ پر اجلاس ہو رہا تھا اپنے خطبۂ صدارت میں محلہ قافلہ کی طرف اشارہ کرکے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا جو ہر طرح سے مطابق حال تھا۔ ؎

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں

سادات رائے بریلی کی یہ شاخ اور مجاہدین بالاکوٹ کے بقیۃ السیف ٹونک میں سالہا سال عسرت و فراغت کی زندگی گذارتے رہے، اور خاص طور پر حضرت سید صاحب کے اخلاف اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ سکونت پذیر تھے۔ کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں تحریک خلافت اپنے نقطۂ عروج پر پہونچی قافلہ والوں کی ہمدردی اور جذبات قدرتاً اس تحریک کے ساتھ تھے۔ والی ریاست نواب ابراہیم علی خاں کو قافلہ والوں سے اندیشہ اور بدگمانی پیدا کرائی گئی اور انہوں نے ریاست سے فوری اخراج کے احکام جاری کر دیئے جاگیریں اور جائیدادیں ضبط کرلیں۔ سادات قافلہ نہایت بے سروسامانی کے ساتھ اس طرح کہ جو کپڑے بدن پر تھے وہی کپڑے لے کر اپنے قدیم وطن رائے بریلی آگئے، یہاں کے اعزہ نے ان کو اپنے گھروں میں ٹھہرایا، انھیں میں عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب بھی تھے جو حضرت سید صاحب کے حقیقی نواسہ سید محمد اسحاق صاحب مرحوم کے فرزند اور ان کی جاگیر و املاک کے تنہا وارث تھے۔ یک جدی ہونے اور دوسری خاندانی قرابتوں کے ساتھ ان سے ہمارے گھر کا ایک قریبی رشتہ یہ تھا کہ ان کی والدہ محترمہ، راقم کے حقیقی دادا مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی[2] مرحوم کی حقیقی چچازاد بہن تھیں، اس طرح ہمارے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے پھوپھی زاد بھائی ہوتے تھے۔ ہم بھائی بہن ان کو چچا جان کہتے تھے، میں نے ان کی زبان سے کئی بار سنا کہ ہم جب تکیہ[1] آئے تو اچھے بھیا مرحوم (یعنی والد ماجد مولانا سید عبدالحی صاحب) نے مجھ سے کہا کہ اسماعیل تم اگر ہمارے گھر ٹھہر گئے تو احسان کرو گے، انھوں نے اس قرابت قریبہ اور والد مرحوم کی اس مخلصانہ دعوت کی بنا پر پیش کش کے احترام میں قیام کے لئے ہمارے ہی گھر کا انتخاب کیا، مجھے یاد ہے کہ میں ۶-۷ سال کا تھا جب یہ حضرات تکیہ آئے، والدہ مرحومہ نے مجھ سے کہا کہ جاؤ تمہارے چچا آئے ہیں ان سے ملو، میں گیا تو دیکھا کہ ایک بڑے وجیہ قوی الجثہ بزرگ (سید محمد اسماعیل صاحب ہیں) انھوں نے مجھے دیکھا تو لپٹا لیا، وہ ہمارے گھر میں رہنے لگے، اور اپنے مکان کی تعمیر تک جو ایک لمبا سال کے بعد وقوع میں آئی، ایک فرد خاندان کی طرح بے تکلف ہمارے گھر میں رہے۔ اس وقت ان کی اولاد نرینہ میں برادر عزیز سید احمد الحسنی تھے جن کی ٹونک میں ولادت ہوئی تھی، اور مجھ سے شاید ۳ یا ۴ سال چھوٹے تھے، ان کے منجھلے بھائی سید ابراہیم حسنی ہمارے ہی گھر میں پیدا ہوئے۔ ان بھائیوں کی والدہ محترمہ ہمارے حقیقی پھوپھا فاضل یگانہ و جامع کمالات مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ایم۔ اے (استاذ اورینٹل کالج لاہور) کی حقیقی بہن تھیں۔ انکا ہماری والدہ صاحبہ کے ساتھ تعلق بالکل حقیقی بہنوں یا سگی بھاوجوں کی طرح تھا۔ ہم اور برادر عزیز سید احمد الحسنی ساتھ کھیلے، اٹھتے بیٹھتے تھے۔ میری فارسی تعلیم کا زمانہ تھا، میں عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب سے جن کی فارسی تعلیم زمانۂ قدیم کی طرح پختہ طریقہ پر ہوئی تھی بوستاں پڑھتا تھا۔

والد مرحوم حکیم سید عبدالحی کی وفات کے بعد جو اوائل ۱۹۲۳ء میں ہوئی ہمارا قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہنے لگا، پھر جب برادر محترم حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم نے ۱۹۲۳ء میں بازار جھاؤلال (حال محمد علی لین گون روڈ) میں مطب شروع کر دیا۔ اور میری عربی تعلیم کا استاد کبیر شیخ خلیل بن محمد الیمانی (استاذ لکھنؤ یونیورسٹی) کے یہاں آغاز ہوا، تو عزیزی احمد بھی زیادہ تر لکھنؤ میں ہمارے مکان پر رہنے لگے۔ اور غالباً خوب صاحب کے یہاں ان کی بھی عربی تعلیم کا آغاز ہوا پھر ہم دونوں مولانا حیدر حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ

---

[1] یہ قصبہ حیدرآباد اور شکارپور کے درمیان واقع ہے، یہاں نسباً سادات، اور نسبتاً قادری شیوخ کا ایک مقتدر و محترم خاندان آباد تھا جس میں دو بھائی ایک سید صبغت اللہ جو سندھیوں کی زبان میں پیر پگاڑو کے لقب سے دوسرے سید محمد یٰسین جو پیر جھنڈے والے کے لقب سے مشہور تھے اور جن کا کتب خانہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں مشہور ہے اسی عالی نسب و بلند نسبت خاندان سادات کی دعوت و نصرت کی بنا پر آپ نے اپنے گھر والوں کو مدت جہاد تک کے لئے یہاں چھوڑا تھا۔

[2] مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی کے مفصل حالات اور علمی، ادبی اور دینی خصوصیات و کمالات کے لئے مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم کی مشہور و مقبول کتاب "تذکرہ گل رعنا" ہے۔ یا "نزہۃ الخواطر" کی آخری جلد میں ان کا تذکرہ پڑھا جائے۔

[1] دائرہ حضرت سید شاہ علم اللہ معروف بہ تکیہ کلاں رائے بریلی۔

انھیں کے حجرہ واقع دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کی سرپرستی اور نگرانی میں رہنے لگے۔

اور احمد مرحوم نے دارالعلوم میں عربی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی کے رہنے والے تھے، اور قافلہ کے خاندان سادات سے ان کے قدیم اور عزیزانہ و مخلصانہ روابط تھے، وہ عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب اور مولانا سید طلحہ صاحب اور ان کے بھائیوں سے خصوصی ربط و تعلق رکھتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی آجاتا تو دیر رات تک ٹونک کا تذکرہ اور اخراج کے واقعات موضوع گفتگو رہتے، قدرتاً اور طبعاً ہم دونوں بھائیوں کو ان کی بزرگانہ شفقت و سرپرستی کا حصہ وافر ملا، یہ یاد نہیں کہ احمد مرحوم نے منظم طریقہ پر دارالعلوم میں کس درجہ تک تعلیم پائی غالباً فضیل عرب صاحب سے بھی استفادہ کیا، عربی زبان سے ان کو خاص مناسبت پیدا ہو گئی۔ لیکن ان کے جوہر کھلنے اور عربی زبان میں اہل زبان کی طرح روانی اور قدرت حاصل ہونے کی تقریب اور اس کا آغاز اس وقت ہوا، جب عربی زبان، اس کے ادبیات اور صرف و نحو کے فاضل یگانہ اور اس میں سند و حجت کا درجہ رکھنے والے عرب فاضل علامہ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں صدر شعبۂ عربی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کا عربی زبان اور اس کے متعلقہ فنون و مقدمات میں وہ بلند پایہ تھا، کہ علامہ سید رشید رضا مرحوم مدیر "المنار" اور امیر البیان امیر شکیب ارسلان کے درمیان جب کسی عربی لفظ یا ترکیب پر اختلاف رائے ہوتا تو علامہ تقی الدین الہلالی ہی کو حکم بناتے اور ان کے فیصلہ کو تسلیم کرتے۔

یوں تو دارالعلوم کے سینئر طلبہ مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور اس راقم سطور نے اپنی عربی استعداد و ذوق میں ان سے گراں بہا فائدہ اٹھایا، لیکن ان سے سب سے بڑا فائدہ برادر عزیز احمد حسنی نے اٹھایا جو اپنی کم عمری کی وجہ سے ان کے گھر میں بے تکلف آتے جاتے تھے، اور ان کے کاموں میں معاونت کرتے تھے احمد مرحوم کی صرف و نحو کی تعلیم تو اپنے فاضل ماموں مولانا سید طلحہ صاحب سے ہوئی، جو صرف و نحو میں ایک ماہر معلم بلکہ امام کا درجہ رکھتے تھے، لیکن عربی زبان پر قدرت اور روانی ہلالی صاحب کی محبت اور شفقت کے زیر سایہ ہوئی، ہلالی صاحب کے ان خطوط میں جو راقم کے نام ہیں، ان کا بڑی شفقت کے ساتھ تذکرہ ہے، اور یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ انھوں نے ان کی صحبت اور رفاقت و معاونت سے بیش قیمت فائدہ اٹھایا ہوگا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسا فائدہ اٹھایا کہ شاید عربی زبان پر ایسی قدرت، گفتگو میں روانی اور طلاقت لسانی ہندوستان کے برصغیر میں چند ہی آدمیوں کو حاصل ہوئی ہو، اسلوب تحریر، وسعت مطالعہ اور انشاء پردازی میں بہت سے افراد ان سے بڑھے ہوئے ہوں گے لیکن اہل زبان کی طرح بے تکلف گفتگو اور اظہار خیال پر قدرت کم ہی لوگوں کو حاصل ہوگی، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کا ذکر بے محل اور نامناسب نہ ہوگا۔

احمد مرحوم اپنی عربی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ابتدائی درجوں میں عربی بول چال اور ابتدائی عربی کتابوں کی تدریس پر مامور ہوئے، اس زمانے میں شہر لکھنؤ کے مشہور و حاذق طبیب شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب مرحوم نے (جن کو مختلف زبانوں سے فطری ذوق اور ان میں گفتگو کرنے کا ملکہ اور قدرت حاصل تھی، جن میں عربی، فارسی، انگریزی، اردو۔ چاروں زبانیں شامل تھیں۔) اپنے مکان واقع کٹرہ ابوتراب خاں واقع یحییٰ گنج لکھنؤ میں عربی میں تقریر کے لئے ایک مجلس قائم کی جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادبی اساتذہ اونچے درجہ کے طلبہ، فرنگی محل کے علماء اور بعض شیعہ مجتہدین اور فضلاء کو بھی دعوت دی جن میں مولانا سید علی نقی مجتہد مدیر رسالہ "الادیب" (عربی (جو بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے استاذ اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے معتمد شعبہ دینیات کے صدر مقرر ہوئے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عربی میں برجستہ تقریریں ہوئیں، عربی زبان کے خاص ماحول اور عرب اساتذہ کے فیض تدریس اور النادی العربی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وجہ سے جب دارالعلوم کے چند ممتاز طلبہ اور اساتذہ نے عربی میں تقریریں کیں تو پھر ان کے سامنے کسی کا رنگ نہیں جما، اور انکا تفوق نمایاں طریقہ پر ظاہر ہوا، شہر کے اس مجلس میں ایک صاحب کو جو غالباً مولانا سید علی نقی صاحب کے ساتھ آئے تھے، یہ بات بڑی گراں گذری۔ انھوں نے دیکھا کہ راقم کے پہلو میں اس کے عزیز بیٹھے ہوئے ہیں، جو اس کے چھوٹے بھائی معلوم ہوتے ہیں، احمد مرحوم کو جہاں تک گفتگو اور مشق و روانی کا تعلق ہے عربی میں کمال حاصل تھا لیکن وہ مقرر نہیں تھے اور یہ کسی قدر ہمارے خاندان کی خصوصیت ہے کہ اس میں عوامی مقرر کم اور اہل قلم اور مصنف زیادہ گذرے ہیں، انھوں نے جب احمد سے تقریر کی فرمائش کی تو انھوں نے معذرت کی اور ہم لوگوں نے بھی کہا کہ جلسہ ختم ہو گیا۔ اب کسی نئی تقریر کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے یہ سمجھ کر کہ احمد تقریر پر قادر نہیں ہیں اور انکے تقریر نہ کر سکنے سے اس فرق کی کچھ تلافی ہو سکے گی جو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے انتساب رکھنے والے اساتذہ اور طلبہ کی قادر الکلامی اور طلاقت لسانی سے پیدا ہو گیا ہے۔ ان کا اصرار بڑھتا گیا اور احمد کا انکار، یہاں تک کہ ہم لوگ باہر نکل کر نخاس روڈ پر آ گئے جہاں سے ہم کو سواریوں پر اپنے اپنے ٹھکانہ جانا تھا، ان صاحب نے وہاں بہ شدت کہا کہ ہم ان کی تقریر سنے بغیر جا ہی نہیں سکتے، مجبوراً ہم لوگ واپس آئے، راقم نے احمد سے کہا کہ پھر اللہ کا نام لے کر کچھ تقریر کر ہی ڈالو، انھوں نے واپس آ کر پھر ایسی برجستہ اور زوردار تقریر کی کہ ساری محفل پر اس کا جادو چل گیا، اور پچھلی تقریروں سے بھی وہ بازی لے گئی، اور وہ صاحب جنھوں نے ان کی ذلت اور ہماری سبکی کا سامان کیا تھا، خود خفیف اور شرمندہ ہوئے، اسی ذیل میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب وہ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے شفیق ماموں اور استاد مولانا سید طلحہ صاحب حسنی کی خدمت میں رہنے اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور گئے اور ان کی عربی زبان پر قدرت کا وہاں کے بعض اہل علم و ذوق کو علم ہوا تو انھوں نے ایک عام جلسہ کا انتظام کیا جس کی صدارت کے لئے اس وقت کے مسلمانوں کے نامور سیاسی قائد اور ادیب، خطیب و شاعر مولانا ظفر علی خاں "مدیر" زمیندار" کا انتخاب کیا، اور ایک اشتہار شائع کیا جس میں لکھا تھا۔ کہ "کون کہتا ہے کہ اس زمانہ میں ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ نہیں ہیں، لوگ آئیں، اور ایک ہندستانی نژاد کی عربی پر قدرت اور روانی اور طلاقت لسانی دیکھیں" راقم کو اسکے کچھ دن بعد ہی لاہور جانے کا اتفاق ہوا اس وقت تک غالباً یہ اشتہارات دیواروں پر چسپاں تھے، اور اس مجلس کا چرچہ تھا، احمد مرحوم نے عربی میں تقریر کی اور عربوں کے خصوصی اخلاق اور مزاج کے تذکرے میں استشہاداً برجستہ عربی کے اشعار پڑھے، غالباً اپنی صدارتی تقریر میں مولانا ظفر علی خاں نے ان کی مہارت لسانی اور قدرت بیانی کی داد دی، یہ ایک ایسا شرف و امتیاز تھا جو صغیر السن اور جواں سال عربی دانوں کو مشکل سے حاصل ہوا ہوگا۔

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مدرسی کے ساتھ بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلیؒ صاحب) کے تعارف اور سفارش پر ڈاکٹر محمود اللہ جنگ پارلیمنٹری سکریٹری پنڈت گووند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ نے ان کو اپنے بچوں کا دینی و تعلیمی ٹیوٹر مقرر کیا اور وہ غالباً کئی سال تک یہ فرض انجام دیتے رہے ۳۱-۲۲ء میں وہ لاہور میں تھے، راقم نے جب حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تفسیر قرآن کا درس لینا شروع کیا تو وہ بھی شریک درس تھے، پھر وہ لکھنؤ آ گئے اور حسب سابق دارالعلوم میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس عرصہ میں (غالباً ۳۲ء میں) سادات قافلہ کے اخراج کا حکم منسوخ ہوا، اور عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب اور دوسرے افراد خاندان جو ایک طرح سے ہجرت کی زندگی گذار رہے تھے اپنے قدیم مسکن محلہ قافلہ ٹونک واپس ہوئے۔ ان کو جاگیریں اور جائیدادیں تو واپس نہیں ہوئیں، مگر وہ اپنے ثانوی وطن مالوف اور وسیع مکانات میں دوبارہ سکونت پذیر ہو گئے، اس وقت سے سید احمد الحسنی دبرادران زیادہ تر ٹونک رہنے لگے۔ احمد مرحوم نے لاہور ٹھہر کر اپنی انگریزی کی تعلیم جاری کی، اسی عرصہ میں ۳۴-۳۵ء میں ان کا شملہ کے ریڈیو اسٹیشن پر تقرر ہوا جہاں وہ عربی تقریروں اور ممالک عربیہ کے ریڈیو اسٹیشن کے ضروری اقتباسات انگریزی میں پیش کرتے، اسی کے ساتھ کچھ انگریزوں نے ان سے عربی پڑھنی شروع کیا، اسی زمانہ میں ۴۳ء میں وہ کسی ضرورت سے دہلی آئے یہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ، بانی جماعت تبلیغ کی آخری علالت کا وقت تھا اور ضعف انتہا کو پہونچا ہوا تھا، میں انکو حضرت کی زیارت کے لئے حضرت کے حجرہ میں لے گیا، حضرت اس وقت کچھ گفتگو نہیں فرما سکتے تھے، حضرت کی اس طویل و شدید بیماری کی وجہ سے متعدد اہل تعلق اور بزرگان دین اور اپنے وقت کے کبار علماء و مشائخ نظام الدین بنگلہ والی مسجد (تبلیغی مرکز) میں مقیم تھے جن میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ، اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں احمد کو ان کی خدمت میں لے کر گیا اور ان کا اس طرح تعارف کرایا کہ یہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے سب سے زیادہ نسبی نسبت و تعلق رکھتے ہیں، اور حضرت کے حقیقی نواسے کے پوتے ہیں، ان حضرات نے سلسلۂ دیوبند کے دوسرے بزرگوں اور مشائخ کی طرح اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا، اور

بڑی شفقت اور کسی قدر اکرام و احترام کے ساتھ ملے، دوپہر کا کھانا بھی ہم سب نے ساتھ کھایا کھانے کے بعد جب احمد رخصت ہوئے تو میں نے معذرۃً عرض کیا کہ ہمارے یہ بھائی عرصہ سے ایک غیر دینی ماحول میں رہتے ہیں اور انگریزوں کو پڑھاتے ہیں، اس کا ان کی صورت و وضع پر کچھ اثر ہے، ان حضرات نے فرط تعلق و محبت میں مجھے اس سے کچھ زیادہ کہنے کی اجازت نہیں دی، اور ایسا اشارہ کیا کہ میں خاموش ہو گیا، اس سے اندازہ ہوا کہ ان اکابر اور شیوخ کو حضرت سید صاحب اور ان سے نسبت و تعلق رکھنے والوں کے ساتھ کیسا تعلق اور اس کا کتنا لحاظ و احترام ہے، الحمدللہ بعد میں انھوں نے دینی ترقی کی جس کے آثار چہرہ و وضع و ہیئت پر نمودار ہوئے۔

تقسیم ہند ۴۷ء کے بعد یا اس سے کچھ پیشتر احمد لاہور چلے گئے اور لاہور، کراچی میں اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کی اور عربی میں ایم۔ اے کیا، کراچی یونیورسٹی میں زمانۂ تعلیم میں علامہ عبدالعزیز میمن سے بھی ان کا رابطہ رہا جو مولانا سید طلحہ صاحب کے ساتھ عرصہ تک اور اورینٹل کالج لاہور میں تدریس کا کام کرنے کی وجہ سے ان سے خاندانی طور پر واقف تھے، تعلیم کی تکمیل کر لینے کے بعد وہ پاکستانی وزارت خارجہ اور اس کے سفارتخانہ میں ملازم ہو گئے، اور ترجمان اور کلچرل اٹیچی کا کام کرنے لگے، اس سلسلہ میں وہ عرصہ تک قاہرہ کے پاکستانی سفارت خانہ میں پھر جدہ کے پاکستانی سفارت خانہ میں کام کرتے رہے ۱۹۵۷ء میں سابق سفیر پاکستان متعینہ سعودی عرب خواجہ شہاب الدین کے ہمراہ ان کے ترجمان کی حیثیت سے شاہ فیصل مرحوم سے ریاض میں ملے، اس وقت شاہ شہید اپنے ملک کے با اختیار وزیر اعظم و وزیر خارجہ تھے اس کے بعد طائف اور جدہ میں بھی سفیر پاکستان کے ہمراہ شاہ شہید سے کئی بار ملاقات[1] اور ترجمانی کا شرف حاصل ہوا۔ اپریل ۶۶ء شاہ شہید پاکستان کے دورہ پر تشریف لائے تو ایوب خاں مرحوم سابق صدر پاکستان سے گفتگو کے موقع پر بھی انھیں نے ترجمانی کا فرض انجام دیا، لاہور، پشاور، کراچی کے استقبالیہ میں وہی ترجمان رہتے تھے، جب شاہ مرحوم اس پاکستانی دورہ میں عوام کو خطاب کرتے تھے تو ان کو ساتھ ساتھ اردو میں ان کی ترجمانی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ شاہ مرحوم نے ان کی کارکردگی پر اظہار مسرت کے طور پر کوئی ہدیہ یا انعام بھی دیا تھا۔

پاکستانی وزارت خارجہ کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا تعلق سعودی سفارتخانہ واقع اسلام آباد سے ہو گیا تھا، جہاں وہ ثقافتی امور اور تعلقات عامہ کے ذمہ دار تھے، اور وفات کے قریب تک وہ یہی خدمت انجام دیتے رہے، ۱۹۷۸ء میں رابطۂ عالم اسلامی (مکہ معظمہ) نے اپنی ایشیائی کانفرنس کراچی میں منعقد کی جس میں وہ حجاز سے آ کر (جہاں اس وقت میرا قیام تھا) کراچی میں اجلاس میں شرکت کی، میرے ساتھ برادرزادہ عزیز محمد الحسنی مرحوم اور عزیزی اسحاق جلیس ندوی مدیر "تعمیر حیات" بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے، عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب ندوی میرے ساتھ ہی حجاز سے آئے تھے، ہم سب کراچی سے فارغ ہو کر اسلام آباد، راولپنڈی آئے، احمد مرحوم نے اسلام آباد کے ہوائی اڈہ پر ہم سب کا استقبال کیا، اسلام آباد سے ہم لوگ مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی دعوت پر اکوڑہ گئے، اس سفر میں محترمی سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین (جو دارالمصنفین کی ضرورت سے پاکستان آئے ہوئے تھے) اور عزیزی احمد الحسنی بھی ساتھ تھے۔ اس سفر میں غالباً انھوں نے پہلی مرتبہ اکوڑہ خٹک کی زیارت کی، جہاں ان کے جد امجد حضرت سید احمد شہیدؒ کی امامت و قیادت میں طویل عرصہ کے بعد صحیح دینی نظام اور شرعی اصول کے مطابق جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ میں جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز ہوا تھا اور لشکر مجاہدین نے فتح حاصل کی تھی، اس سفر میں متعدد مقامات پر اور کئی روز ان کا ساتھ رہا،

وہ طبعاً ہشاش بشاش، متواضع اور سادہ اور زندہ دل واقع ہوئے تھے، نسبی یا علمی افتخار و غرور کا شائبہ بھی نہ تھا بڑے لطیفہ گو، بذلہ سنج اور ظریف الطبع تھے (ان کے خطوط بھی جس میں وہ راقم کو عام طور پر "علی بھیا" یا کبھی سیدی علی بھیا سے خطاب کرتے تھے۔ ان کی محبت اور سادہ و بے تکلف تحریر کا نمونہ ہیں) اسکے بعد شاید ایک دو بار کسی بیرونی ملک سے آتے ہوئے پاکستان کے ایک دو روز قیام میں ان سے ملاقات ہوئی، شدید آرزو تھی کہ وہ ایک مرتبہ اپنے اور اپنے خاندان کے وطن قدیم رائے بریلی آئیں اور سب اعزہ اور افراد خاندان ان سے ملنے کی مسرت حاصل کریں، لکھنؤ بھی آئیں جہاں انھوں نے طویل عرصہ تک قیام کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو ترقی یافتہ اور وسعت پذیر شکل میں دیکھیں اور سب اہل تعلق اور حضرت سید صاحب سے عقیدت اور نسبت رکھنے والے اعزہ اور احباب ملیں۔ موقعہ ہو تو ٹونک بھی جائیں جہاں ان کے خاندان کی ایک شاخ نے سو برس کے قریب قیام کیا۔ اور ان کی تین پشتیں گذریں۔ انھوں نے سفر ہند کے بجائے سفر آخرت اختیار کیا اور یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ ع

"یک حرف کا شکست کہ صد جا نوشتہ ایم"

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور ان کو اپنے آبائے کرام سے ملائے،

وصدق اللہ العظیم۔

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ

---

[1] شاہ مرحوم کے دورہ پاکستان اور احمد مرحوم کی ترجمانی کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہفت روزہ "المنبر" لائل پور کے فیصل شہید نمبر (اکتوبر ۱۹۷۵ء) میں ہو گیا ہے ملاحظہ ہو ص ۲۵-۲۶۔

بقیہ
یہ سکن نہ تھا.....

ادارہ تحقیقات و نشریات اسلام مولانا کی اردو اور عربی مطبوعات چھاپنے کا اہتمام کرتا ہے اس کے دفتر میں چائے کا انتظام تھا، پچھلے دنوں میں مولانا کے قلم سے سید نا علی مرتضیٰ کی سوانح پر بڑی معرکۃ الآراء کتاب نکلی ہے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں اس کے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ میں ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ میں اس پر ایک تفصیلی تبصرہ پڑھ چکا تھا۔ دل میں تھا کہ اس کتاب کا مولانا سے تقاضا کروں گا۔ یہ ان کا تصرف روحانی تھا کہ ادارہ کے کارپردازوں کو انھوں نے کتابوں کا جو پیکٹ میرے لیے تیار کرنے کا پیشگی حکم دے رکھا تھا اس میں "المرتضیٰ" کے اردو اور عربی دونوں ہی ایڈیشن شامل تھے۔

چائے کے بعد میں نے اجازت لی تو فرمایا چند منٹ کے لئے مہمان خانہ چلیں، وہاں کچھ اور احباب بھی آپ سے ملنے کے متمنی ہیں میں نے عرض کیا مجھے تو آپ کی مصروفیات کا پاس ہے ورنہ آپ کی محبت سے فیضیاب ہونے کے یہ مواقع کہاں ملتے ہیں، میں نے شعر پڑھا: ع

ٹھہر بھی جا در ساقی پہ دو گھڑی کے لئے
تمام عمر پڑی ہے روا روی کے لئے

فرمایا مصحفی نے بھی کہا ہے:

ٹھہر بھی جا، جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

مہمان خانہ کے باہر کرسیوں پر چند منٹ نشست رہی میں نے اپنی کتاب "جنھیں میں نے دیکھا" کا نسخہ پیش کیا اسمیں ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی، ایک ایک نام پڑھا..... فرمایا اس میں تو کئی مشترکہ نام شامل ہیں پھر اپنے خادم خاص کو حکم دیا "یہ کتاب میرے کمرے کی کھڑکی پر رکھ دو میں آج رات ہی اس کا مطالعہ کروں گا" رخصت ہوا تو عطر کی تین شیشیاں عطا فرمائیں اور میں حسرت بھری نظروں سے مولانا کے وجود باوجود اور دارالعلوم کی مقدس فضا کو دیکھتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا:

آج بھر کے اسے دیکھ لے کوثر سر بام
جانے ان گلیوں میں پھر کب ترا پھیرا ہوگا

کچھ ہندو بھائیوں کی اپیل...

اگر قانون پر نہیں چھوڑ سکتے اور معاف نہیں کر سکتے تو

جس ہندو نے کسی مسلمان کو قتل کیا ہو صرف اسی پر مسلمان اپنا غصہ اتاریں،
اور جس مسلمان نے کسی ہندو کو قتل کیا ہو تو صرف اسی پر ہندو اپنا غصہ اتاریں
مگر جس ہندو نے کسی مسلمان کا کچھ نہیں بگاڑا اس پر غصہ اتارنا مسلمان کے لئے بزدلی ہے
اور غیر شرعی ہے اسی طرح جس مسلمان نے کسی ہندو کا کچھ نہیں بگاڑا اس پر غصہ اتارنا ہندو کے لئے کائرتا اور ادھرم ہے
بے گناہ معصوموں کا قتل ہندو مسلمان دونوں کے لئے غیر مذہبی
انسانیت کا خون ہے اور باعث شرم ہے۔ ہنگامی حالات میں بھی پیام انسانیت کو
کو نہ بھولیں، انسانیت کا خون نہ کریں، نہ ہونے دیں۔

ملتجی
۱۔ گور بھجن لال۔ کٹرہ خدا یار خاں، لکھنؤ
۲۔ رام لکھن دیکھیت

عِلم کی رَاہ اور اسکی اہمیت

الاصلاح کے جلسہ میں

مولانا محمد رابع صاحب کا ایک معلومات افزا خطاب!

محمد شفیق عالم ندوی

مورخہ ۲۱/۴/۱۰ ۱۴ھ کو بعد نماز مغرب ہماری محبوب انجمن جمعیۃ الاصلاح کی خصوصی دعوت پر مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے انجمن کے اراکین کے سامنے بے تکلف انداز میں خطاب فرمایا، مولانا نے اپنی طویل گفتگو کا آغاز ندوہ کی ابتدائی تاریخ سے کیا جن حالات نے ارباب حل وعقد کو ایک متحد پلیٹ فارم پر جمع ہونے پر مجبور کیا تھا۔ ان کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ اور تحریک ندوۃ العلماء کی پذیرائی کا ذکر کرتے ہوئے ان اسباب وعوامل کی نشاندہی بھی کی جس نے تحریک ندوہ کے کارکنان کو ایک علیحدہ دار التعلیم والتربیۃ کی سنگ بنیاد پر آمادہ کیا۔ نظام تعلیم اور نصاب درس کے بارے میں ندوہ نے لوگوں کے سامنے اپنا جو تخیل اور نظریہ پیش کیا تھا اور نصاب تعلیم کی جن کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا تھا علی العموم اس کو تسلیم کیا گیا، لیکن میدان عمل میں پیش رفت نہیں کی گئی، ایسا نہ کرنے اور اپنی پرانی روش پر گامزن رہنے میں ان کو بہت زیادہ قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ انسان نفسیاتی طور پر کسی خلاف عادت اور نئی بات کے کرنے میں کتراتا اور دامن بچاتا، بے خواہ اس سے نقصان ہوتا ہو۔ تحریک ندوہ کے بارے میں اسی وجہ سے لوگوں کے رویے مختلف رہے۔ اور وہ دشواریوں میں مبتلا رہی اہل بدعت اور انکے زعماء کی طرف سے علی الخصوص اختلاف کی تیز آندھیاں چلیں اسکو ندوہ کے حامیین اور اسکے کارپردازوں کو گمراہ بتایا، مبتدع کہا، وہابی کا لقب دیا، کافر گردانا، غرض نوع بنوع کے الزامات ان پر لگائے گئے۔

تحریک ندوہ نے اپنے قیام کے چند سال بعد اپنے تعلیمی نقطۂ نظر کی عملی وضاحت کے لئے ۱۳۱۶ھ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے نام سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا تھا جو ایک مفید اور مثالی تجربہ تھا لیکن وسائل کما حقہ فراہم نہیں ہوسکے اور نصاب بھی کلی ضرورت کے مطابق نہ تھا اور نئے نصاب کی تیاری کے لئے ضروری وسائل اور برسوں کی مدت چاہئے تھی، مزید یہ کہ اس نظام کو سنبھالنے والے انہی قدیم دانش گاہوں کے فارغین اور پرانی روش پر چلنے والے لوگ ہی ملے، کیونکہ ابتدا ہی سے ایسے اساتذہ اور اہل علم ضرورت کے مطابق کہاں سے مل سکتے تھے جو وقت اور ضرورت کے لحاظ سے تعلیم دے سکیں اور نظام چلاسکیں ان کو اس رنگ و ڈھنگ میں ڈھلنے کے لئے کم از کم ۲۰ سال ۳۰ سال درکار تھے، تب کہیں ایسے افراد کسی حد تک تیار ہوسکتے تھے جو اس فکر کے مطابق پروگرام کو بروئے کار لانے کی عملی وتجرباتی صلاحیت رکھتے ہوں۔

سطور بالا سے یہ حقیقت خود بخود عیاں اور روشن ہوجاتی ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء صرف ایک دانش کدۂ تعلیم وتربیت اور مرکز علم وادب اور منبع رشد وہدایت ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک چلتی پھرتی تحریک اور حرکت کرتا ہوا فکری پروگرام بھی ہے یہ اول تحریک اور دوم دانش گاہ اور دار العلوم ہے اس کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اصحاب فکر کو وقت اور ضرورت کے سمجھنے اور اس کے مطابق نظام تعلیم وتربیت تیار کرنے کی اہمیت بتائے اور قدیم صالح اور جدید نافع کے درمیان حسین ربط پیدا کرے۔ اور ایسے فضلاء تیار کرے جو ملت اسلامیہ کی نت نئی ضرورتوں کو بطریق احسن پورا کرسکیں۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال اور انگریزوں کے تسلط کے بعد مختلف لوگوں نے حریت وآزادی اور اپنی سابقہ پوزیشن کی بازیابی کی بھرپور کوشش کی جس میں سید احمد شہید اور ان کے جاں نثار وجانباز رفقاء کی مخلصانہ کاوشیں خاص اہمیت کے حامل ہیں جن کے نمونے خاص طور پر اہل صادق پور کی قربانیوں میں ملتے ہیں جنھوں نے غیر ملکی استبداد اور دین کی نصرت کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹادیا۔ انکے رہنما حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان کی رفقاء نے بالاکوٹ میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ اور ان کی جماعت کے دیگر لوگوں نے کام کو اپنے وسائل کے مطابق جاری رکھا پھر مسلمان فوج کے اندر بھی آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور ان لوگوں نے بھی انگریزوں کے تسلط کے خلاف جہاد آزادی کا نعرہ میرٹھ کی سرزمین سے بلند کیا۔ لیکن تعداد کی کمی اور ناقص تیاری کی وجہ سے دشمن انگریز پر غلبہ حاصل نہیں کرسکے۔ انگریز کے پاس فوجی حکمت عملی اور وسائل کی کثرت تھی اور وہ شاطرانہ چال بھی چلے اس وجہ سے انھوں نے مسلمان فوج پر نہ صرف غلبہ حاصل کیا، بلکہ اس کا بدلہ بھی لیا، اور چونکہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا تھا اس وجہ سے انگریز نے یہ سمجھ لیا کہ اس کا مقابل دراصل مسلمان ہے چنانچہ ان لوگوں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کی منصوبہ بند کوشش کی ہندؤں کی طرف سے ان کو مخالفت اور کشمکش کا احساس نہ تھا کیونکہ وہ اس وقت تک نمایاں طریقہ سے مقابلہ پر نہیں آئے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو دبانے کیلئے انگریزوں نے دو کام کئے جن سے ان کی طاقت اور وزن بہت کم ہوگیا۔ اول یہ کیا کہ جن لوگوں نے ان کے خلاف آواز اٹھائی تھی انکو نہایت سفاکی کے ساتھ جسمانی اور مادی لحاظ سے ختم کیا۔ اسمیں ہزاروں آدمی پھانسی کے تختوں پر چڑھے، جیلوں میں بھرے گئے اور کالے پانی بھیجے گئے۔

مسلمانوں کو زیر کرنے کا دوسرا یہ کام کیا کہ ان کو تعلیم کے میدان میں حکمت عملی کے ذریعہ پیچھے کیا۔ انگریزی اقتدار کے شروع کے زمانہ اقتدار میں ہندو قوم مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ جرأت مند نہ تھی، مسلمانوں کو ہندو کے مقابلہ میں احساس برتری بھی تھا۔ اس بنیاد پر انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنا اصل حریف سمجھا اور ملک کی زندگی میں ترقی کے مواقع ملنے میں رکاوٹیں ڈالیں، اس طرح ہندو قوم کے افراد کو مختلف میدانوں میں آگے بڑھنے کے مواقع زیادہ ملے، پھر جب ملک تقسیم ہوگیا اور پورے ملک میں قتل وخونریزی کا بازار گرم ہوا، اور مسلمان دو ملکوں میں تقسیم ہوگئے پاکستان علاحدہ ہوگیا لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودگی تقریباً ان کی سابقہ تعداد میں باقی رہی، لیکن اب وہ یہاں تقریباً دوسرے درجہ کے شہری تھے۔ اس سے ان کو کئی نقصان ہوئے۔ وہ تعلیم میں بھی پیچھے ہوتے گئے، جس سے وہ کلیدی مناصب کے حصول میں بھی پیچھے ہوئے، ایسی صورت میں مسلمانوں کے شعور کے صحیح اور بلند ہونے کی ضرورت تھی تاکہ وہ صورت حال کو سمجھتے اور اس کے لئے خود فکر کرتے۔ اگر مسلمانوں میں تعلیم کا بہتر رواج ہوتا اور وہ اپنے مقام کے حصول کے لئے مناسب جدوجہد کرتے تو وہ موجودہ صورتحال میں نہ ہوتے۔ آپ غور کریں کہ امریکہ میں یہودی زیادہ سے زیادہ ۹۰ لاکھ ہیں اور امریکہ کی کل آبادی تقریباً ۲۲ کروڑ ہے پھر بھی پورے ملک میں یہودی ہی کا عمل دخل ہے اور دیگر اہل ملک تقریباً بے دست وپا ہیں یہ صورتحال اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ وہاں یہودی اقلیت نے خاموشی اور ہوشیاری اور محنت سے تین کام کئے اور ان میں بھرپور حصہ لے کر اپنے کو آگے بڑھالیا۔

انکا پہلا کام تعلیم میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینا اور اسمیں محنت شاقہ کرنا تھا۔ تعلیم میں نمایاں مقام پیدا کرنے کے بعد ملک کے اعلیٰ ترین مناصب اور عہدوں پر آہستہ آہستہ فائز ہوتے چلے گئے اور جمہوری حکومت کی وجہ سے سیاست میں حصہ لے کر سیاسی ساکھ بھی قائم کرلی۔ اس طرح اب ان کے بغیر نہ کوئی مسئلہ حل ہوسکتا تھا، اور نہ کوئی اقتصادی معاشرتی اور تعلیمی پالیسی بن سکتی تھی اور نہ ہی ان کے مفاد کے خلاف کوئی منصوبہ تیار ہوسکتا تھا۔

یہودیوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ ذرائع ابلاغ میں بھی اپنا تفوق قائم کرلیا اس میں بھی انکی تعلیمی سرگرمیوں نے ان کو یہ موقع فراہم کیا اور اب صورت حال یہ ہے کہ امریکہ کے اندر نوّے ۹۰٪ فیصدی صحافت انکے زیر اثر ہے۔

تیسری تدبیر مالی اور اقتصادی استحکام کی کی۔ جو ان کی سیاسی گرمیوں اور اعلیٰ تعلیمی اور صحافتی دلچسپیوں کا لازمی نتیجہ تھی فی الحال وہاں اگر کوئی ایسا ریزولیشن پاس ہوجاتا ہے جسمیں ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے یا اس سے مذہبی جذبہ پر ضرب پڑتی ہے، تو پورے ملک کے یہودی اس کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور تار پر تار دیتے ہیں اور رسائل پر رسائل لکھتے ہیں، اور ایک ہنگامہ برپا کردیتے ہیں، بالآخر حکومت کی رائے پر اثر پڑتا ہے اور اس کو لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ پورے ملک کے اقتصادی نظام پر بھی یہودی قابض ہیں اور ملک کی بینکنگ نظام تقریباً ان کے ہاتھوں میں ہے۔

گذشتہ برسوں میں جب حضرت مولانا مدظلہ کا امریکہ کا سفر ہوا تھا اس میں میں بھی ساتھ تھا، اس سفر میں وہاں کی مختلف تعلیمی تربیتی اور معاشرتی سرگرمیوں کا جائزہ لینے اور اقتصادی وسیاسی حالات کا اندازہ لگانے کا موقع ملا، جس کو سفرنامۂ امریکہ میں بیان کیا ہے۔ وہاں ہم کو بتایا گیا کہ یہودی طلبہ محنت اور کد وکاوش کرنے میں دوسروں سے کہیں فائق ہیں۔ وہ استاد کے پیچھے سایہ کیطرح لگ جاتے ہیں۔ اور ان سے استفادہ کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور ہر ممکن

طریقہ سے ان سے کسب فیض کرتے ہیں۔ اور وہاں چونکہ ذرائع ووسائل کی فراوانی اور بہتات ہے۔ ساتھ ہی صاحب فن بھی بکثرت موجود ہیں۔ اس وجہ سے اساتذہ کی بھی بڑی تعداد ہے۔ اعلیٰ درجات میں ایک استاد کے حصہ میں صرف چند چند طالب علم آتے ہیں۔ انہی پر ان کی ساری توجہ مرکوز رہتی ہے علاحدہ علاحدہ فنون میں اپنی ذہنی صلاحیت اور مناسبت کے لحاظ سے تقسیم ہوجاتے ہیں۔ اور ساری کوشش اپنے مخصوص فن میں صرف کرتے ہیں ان کی کامیابی کا معیار ان کی مقدار محنت وترقی ہوتا تھا۔ ہمارے ملک میں چونکہ وسائل کی کمی ہے تعلیمی اوسط بھی کم ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ تعلیم پر محنت توجہ اور یکسوئی بھی کم ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ جس طرح ضروریات کے حصول کیلئے کارخانے ہوتے ہیں جہاں چیزیں بنتی اور نکلتی ہیں اور انسانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ اگر وہاں سے نکلنے والے ساز وسامان اور مصنوعات انسان کی ضرورت وحاجت کو پورا نہ کرسکے تو وہ کارخانے بیکار اور غیر مفید قرار پائیں گے۔ ٹھیک اسی طرح دنیا کی جملہ دانشگاہیں تعلیمی ادارے اور اعلیٰ مرکز قوم کی ضرورت کے افراد تیار کرتے ہیں ان سے ایسے ہی افراد اور مردان کار تیار ہونا چاہیں جو ملک وقوم کی ضرورت کو پورا کریں۔ اگر صورتحال اس کے برعکس ہے تو افراد سازی کا بندوبست اور نظام تعلیم ناقص اور غیر صالح ہے اسکے اندر بھول اور کمزوریاں ہیں ان کی اصلاح لازمی اور ضروری ہے اس کے بغیر ان کا وجود ایک لاحاصل شئے اور لاطائل عمل ہے۔

دنیا کا تعلیمی نظام تین ستونوں پر قائم ہے اگر ان میں سے کوئی ستون بھی کمزور ہوا تو نظام تعلیم یا درہم برہم ہوجائے گا یا اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ تعلیم کے یہ تینوں عناصر، طلباء، اساتذہ اور نصاب ہیں ان میں سے کسی ایک عنصر کی کوتاہی یا کمزوری ہوئی تو پورا مقصد حاصل نہیں ہوگا طالبان علوم کے لئے محنت وکوشش اور جد وجہد ترقی کا زینہ ہے اس کے بغیر کوئی اعلیٰ مقام کو نہیں حاصل کرسکتا ہے۔ انسانوں اور تمدن کی تاریخ چھان ڈالئے کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جو بغیر کد وکاوش کے مقام بلند پر فائز ہوا ہو۔ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسان صرف اپنی ذہانت اور ذکاوت ہی سے بڑا نہیں بنتا ہے۔ اس کے لئے محنت وکوشش لازمی ہے۔ انسان کا ذہن ایک طرح سے ٹیپ ریکارڈر ہے۔ اس میں جب تک کچھ داخل نہیں کیا جائے گا، اس سے کچھ نکل نہیں سکتا ہے اور یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے کسی بھی بشر کے ساتھ ناانصافی نہیں کی سب کو ترقی کرنے اور کام کرنے کی صلاحیت دی ہے، اگر کسی کی کسی ایک صلاحیت میں کمی کی ہے تو اس کی دوسری صلاحیت کی طاقت بڑھادی ہے۔ اور کم از کم محنت کرنے کی صلاحیت ایک عجیب ہتھیار کے طور پر اسکو دی ہے جس سے وہ اپنی دوسری کمزوریوں کی بھی تلافی کرلیتا ہے، اگر حافظہ کمزور ہو یا اسی طرح کی اور کوئی کمزوری ہو تو محنت کرنے سے تلافی ہوجاتی ہے۔ منفلوطی جو ایک مشہور ادیب گذرے ہیں انھوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ہم کو ہمارے حافظہ کی کمزوری نے بڑا فائدہ پہونچایا کہ ہم نے اس کمزوری کے احساس سے جانفشانی کی جس نے ہم کو بڑا فائدہ پہونچایا انسان کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ہے "وان سعیکم سوف یری"

اس کا بدلہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے طلبہ دوران تعلیم بہت کچھ پڑھتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ ہمارے دماغ نے کچھ محفوظ نہیں رکھا، لیکن جب تعلیمی زمانے کو پورا کریں گے تو اس کے نتائج اپنی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

ایک مزید امر کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ زندگی میں مختلف مسلمات ہیں ان میں سے ایک مسلم حقیقت یہ ہے کہ استاد کی ناقدری اور اس کی بے احترامی کرنے والا علم میں اور کم از کم اس کے فن میں کامیاب نہیں ہوتا بلکہ نقصان اٹھاتا ہے اور والدین کی نافرمانی کرنے اور ان کا پاس ولحاظ نہ کرنے میں زندگی ناکام ہوتی ہے اور راحت وآرام نصیب ہوتا طلبہ کو علمی کد وکاوش کے ساتھ ان باتوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے اور ان میں کبھی غفلت اور سستی نہیں کرنا چاہئے ورنہ وہ بڑی دانش گاہ میں ہونے کے باوجود اپنا مستقبل درست نہیں کرسکتے۔

مسلمانوں کی موجودہ ضرورت کے لحاظ سے علوم کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے علوم دینیہ، علوم اجتماعیہ، علوم سائنس دور حاضر میں چونکہ ہر علم کی مختلف شاخیں نکل چکی ہیں۔ اس لئے کسی ایک شخص کیلئے جملہ علوم مع اس کے جملہ شاخوں میں مہارت پیدا کرنا ممکنات میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے کسی ایک علم یا اس کے کسی ایک شق میں اختصاص کرنا چاہیے اور دوسرے اقسام سے مناسبت اور ان میں مشارکت ہونا چاہیئے، ہم حاملین علوم کتاب وسنت کو اور جب کہ ہم خاص دینی درسگاہ سے وابستہ ہوچکے ہیں تو ——— دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم کو علوم دینیہ میں تفوق وبرتری حاصل کرنا ہے، اور دوسرے علوم میں مشارکت کرنا ہے تاکہ ان کی واقفیت سے بھی ہم محروم نہ رہیں، علوم دینیہ میں ہماری حیثیت معطی اور مراجع کی ہو ہم ان میں دوسروں کے لئے مرجع ہوں تاکہ ہم ان میں دوسروں کے دست نگر نہ ہوں۔ اسی کے ساتھ دیگر علوم میں۔ مثلاً علوم اجتماعیہ میں اتنی مشارکت ہو کہ ہم ان میں اپنی بنیادی ضرورت پوری کرسکیں۔ اور اس مرحلے میں کسی کا تعاون نہ لینا پڑے۔ آخر میں آپ سے پھر کہتا ہوں، آپ دنیا کی اونچی سے اونچی حیثیت اور مقام کو حاصل کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہر انسان کے پاس صلاحیت ہوتی ہے آپ ہر ایسی بڑی شخصیت بن سکتے ہیں جو دنیا میں کوئی دوسرا فرد بن سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی کوتاہی سے اپنی ترقی کی راہ نہ بنائیں نبی کے علاوہ دیگر کوئی اور انسان ——— بڑا بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا جاتا۔ اسی دنیا میں محنت وکوشش کرکے ہی بنتا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ علم میں ترقی کی منزل برابر جاری رہتی ہے" یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم پوری ترقی کرچکے، اب مزید کی ضرورت نہیں ہے، علم کے راستے میں چلنے والے کو جب اس کا احساس ہوگا کہ اب ہم کچھ بن گئے اس دن سے اس کی ترقی رک جائے گی۔ ہاں اپنے اندر احساس کمتری نہ پیدا ہونا چاہیئے۔ اور کسی علمی معاملے کے بارے میں کبھی یہ خیال دل میں نہ آئے کہ یہ کام میری سطح سے بلند یا مشکل ہے یا مجھ سے نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ذہن بن گیا تو اس سے کوئی کارنامہ ظہور میں نہیں آسکتا۔ انسان کو ہمیشہ مثبت طریق فکر اختیار کرنا چاہیئے یہ اس کے لئے باعث ترقی ہوگا۔ میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اسمیں مختلف مفید باتیں آگئی ہیں۔ اگر آپ ان کو دماغ میں محفوظ کرلیا تو انشاء اللہ فائدہ اٹھائیں گے

آپ اس وقت ندوہ کی چہار دیواری کے اندر ہیں۔ اس دور میں برصغیر ہند وپاک میں الحمد للہ ندوہ کی جو شہرت اور مقبولیت ہے وہ آپ سے مخفی نہ ہوگی۔ ہمارا یہ ادارہ عالم اسلام اور بالخصوص عرب دنیا میں سب سے کچھ زیادہ وقعت وعزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی یہ شہرت ومقبولیت محض خدا کا فضل وکرم ہے۔ اس کی آپ کو قدر ہونا چاہیئے اور یہاں سے جو فائدہ خصوصی طور پر آپ اٹھا سکتے ہیں اسمیں کوتاہی نہ کریں۔ آئندہ امت کی باگ آپ حضرات کے ہاتھ آئے گی۔ اسمیں آپکو اپنے مادر علمی کی بھرپور نمائندگی کرنی ہے۔ اور اس کے بانیوں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنا ہے۔ آپکی نسبت اس سے قائم ہوگئی ہے تو اب لوگ آپ کو اس توسط سے دیکھیں گے، آپ اسکا خیال رکھیں۔ اور ادارہ سے تعلق بھی رکھیں۔ بقائے تعلق سے فائدہ خود آپ کو ہوگا اور قطع تعلق سے نقصان بھی آپ ہی کو ہوگا۔ آپ اس سے رشتہ جوڑ کر رکھیں انشاء اللہ زندگی میں تابندگی اور درخشندگی آئے گی۔

ع: "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

علم اور اہل علم:

علم کی پہچان اور اہل علم کی شان یہ ہے کہ وہ متین، سنجیدہ اور باوقار ہوں خفیف الحرکتی سے پاک ہوں۔ قول وفعل، قیام وقعود، گفت وشنید اور حرکت وعمل ہر چیز میں سنجیدگی اور متانت کا اظہار ہو علم کا اثر اگر عمل اور کردار میں نہ ہو تو اس کی مثال حامل اسفار کی ہوتی ہے۔

آپ کو زندگی کی رزم گاہ میں لوگ صرف ایک بار آزمائیں گے، اور جو رائے قائم ہوجائے گی مرتے دم تک وہی رائے قائم رہے گی۔ پہلے قائم ہونے والی رائے میں تبدیلی بہت کم ہوتی ہے۔

لہٰذا زندگی کے میدان میں قدم رکھیں تو پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔

آخر میں ہم خدا سے دعا گو ہیں کہ وہ آپکے لئے نیکی کی راہ ہموار اور آسان کرے اور آپ کو توفیق دے اس کی خوشنودی اور رحمت حاصل ہوں۔ اور آپ کی زندگی میں خیر وبرکتوں کی بارش کرے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

لکھنؤ کے معروف عطریات
شمامۃ العنبر، زعفرانی حنا
مجموعہ وغیرہ
طلب فرمائیں
کارخانہ محمد سلیمان محمد یوسف
یوسف بلڈنگ۔ ۸۰ اماں الدولہ پارک روڈ
لکھنؤ

إن هذا إلا ملك كريم

مولانا عبد الباری ندوی

(چوتھی اور آخری قسط)

ہمارے ڈاکٹر صاحب ایک طرف دینی تعلیم گاہوں کی تربیتی خامیوں کو خوب جانتے اور ذکر فرماتے رہتے دوسری طرف "قوا انفسکم واھلیکم نارًا" والی اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس فرماتے اسلئے عمر بھر ناظم ندوہ رہ کر بھی دارالعلوم ندوہ کے بہانے "رب ارحمھما کما ربیانی صغیرًا" کا ترتیبی حق جیسا انھوں نے اپنی اولاد کے حق میں بہ نفس نفیس خود ادا فرمایا اس کی مثالیں اب امت کے خواص میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ ابتدائی تعلیم بھی براہ راست اپنی نگرانی میں گھر پر استاد رکھ کر دلواتے وہ بھی خالی کتابی استاد نہیں اچھا مومن صالح ہوتا۔ پھر آگے کی تعلیم کی بسم اللہ بذات خود ذالک الکتاب سے کراتے جس انوکھے طرز سے کراتے اس کے موجد و عامل بھی تمام تر خود ہی تھے۔ یعنی قواعد یا صرف و نحو کے ایک حرف کے بغیر علم قرآن کے ساتھ ساتھ ہی زبانی قرآن بھی سکھلاتے جاتے، اس طرح کر بچوں کی قصہ پسند فطرت و سہولت کے مد نظر پہلے حضرات انبیاء کے قصے پڑھاتے حضرت علی میاں سلمہم کو قصص النبیین کی ترتیب و تالیف کا خیال غالبًا حضرت مرحوم کے اس طرز خاص سے ملی، صرف و نحو کی تعلیم پر ہمارے عربی مدرسوں میں جتنا زور دیا جاتا ہے میں بھی اس کو وقت و قوت کی اضاعت ہی جانتا تھا۔ لیکن سرے سے ان سے استثنا کا سبق ڈاکٹر صاحب ہی سے پڑھا۔ باقی خود اپنی اولاد پر جس کامیابی کے ساتھ انھوں نے اس کا تجربہ فرمایا اس کی وہ بالکل مستثنیٰ آپ اپنی مثال تھے۔ اور صاحبزادہ سلمہٗ ماشاء اللہ عربی انشاء و ادب میں بھی اس کامیابی کی ایسی جیتی جاگتی یادگار ہیں کہ انشاء اللہ عرب و عجم کے علم، منشی و ادیب اپنے عم محترم کے نام کو چار چاند لگائیں گے۔

تعلیم سے بھی بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی ترتیبی فہم و فکر کی شان جیسی اسلامی و یگانہ تھی اس کے اندازہ کے لئے چند خطوط ہی کافی ہیں۔ جو الفرقان کی بدولت منظر عام پر آگئے ہیں سمجھ یہ رکھا تھا کہ راقم حروف سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کو اندر باہر سے جاننے پہچاننے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو لیکن ان خطوں کو پڑھ کر یہ خوش فہمی بھی بس خوش فہمی ہی نکلی۔ دورہ کر اپنے زیر تربیتوں یا زیر نگرانوں کی جیسی مربیانہ نفسیاتی فہم و فکر کی گہرائی کے ساتھ نگرانی فرماتے اس کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے اپنے برادر عزیز از جان (مولانا علی میاں سلمہٗ) کے نام ایک ہی خط کی چند مختصر ہدایات و سوالات کو پڑھ لینا کافی ہوگا

اپنے چوبیس گھنٹے کے پروگرام سے مطلع کرو اور یہ بھی لکھو کہ تعبرات جمعہ کو سبق ہوتا ہے یا نہیں۔ اور ان ایام کے علاوہ بھی کسی مسئلہ پر گفتگو کا موقع ملتا ہے یا نہیں یہ بھی لکھو کہ حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ کی خدمت میں رہنے کا کتنا موقع ملتا ہے۔ جہاں رہتے ہو وہاں کے دوسرے رہنے والوں سے تعلقات کیسے ہیں اور وہ کس قسم کے لوگ ہیں"

جب تم وہاں گئے تھے اسی وقت سے اب تک اپنے میں کوئی تغیر محسوس کرتے ہو یا نہیں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا مفصل جواب لکھو تاکہ کوئی بات رہ جائے نہ صرف یہ سوالات ہی کیسی عمیق مربیانہ و نفسیاتی نظر کا پتہ دے رہے ہیں۔

ایک اور بڑی خوش فہمی بعض احباب و اکابر کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنا بس ایک نشہ کا مغلوبانہ حال یہ بن گیا ہے۔ کہ دین کیا دنیا تک کی کوئی گفتگو تھانہ بھون کے پیر مغاں کا نام لئے بغیر نہیں بن پڑتی، وجہ یہ کہ دق کے ایک آخری درجہ کے مریض کو جس حاذق معالج سے اللہ تعالیٰ نے کم از کم اتنا کر دیا ہو کہ بستر پر پڑے پڑے زندگی کی سانسیں لے رہا ہو، اس کی معمولی انسانیت کا تقاضا ہے کہ اپنے پرانے مریضوں کو موقع آنے پر ایسے معالج کی حذاقت کے اپنے ذاتی تجربات تو سنا ہی دے ورنہ ان کے حق میں سوا بدخواہی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔ خدا گواہ ہے کہ راقم احقر ظاہر و باطن کے دینی امراض کا ایسا ہی آخری درجہ کا دق زدہ بیمار تھا۔ اور اب اللہ تعالیٰ ٹوٹے پھوٹے ایمان کی سلامتی کے ساتھ خاتمہ و مغفرت فرما دیں۔ تو امت کے اس حاذق حکیم کے علاج نیز دوسرے بزرگوں کی دعائی توجہ ہی لے دے کر اپنا سارا سرمایہ نظر آتا ہے

کہنا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے سامع و مخاطب کو پا کر اپنے اس مغلوبانہ حال پر کیسے قابو پا سکتا۔ ہاں چوری چوری اور طویل طویل مجالست کا موضوع حکیم الامہ علیہ الرحمہ ہی کی علمی و عملی، تعلیمی و تربیتی، اصلاحی و تجدیدی دیدہ و خواندہ باتیں رہتیں۔ بات بات پر ممدوح کے شرح عدد کی کیفیت و مسرت چہرہ سے نمایاں رہتی۔ کتابیں بھی حضرت کی پڑھتے دوسرں خصوصًا صاحبزادہ سلمہٗ کو تاکیدی مشورہ دیتے۔ سلسلہ تجدید کی کتابیں ہدیہ پیش کرتے رہنا تو مؤلف اپنی سعادت ہی جانتا۔ مگر وہ پڑھنا زیادہ تر براہ راست خود حضرت ہی کی چیزوں کو پسند فرماتے۔ آخر میں البتہ ایک دن خود ہی تجدید تصوف کی خصوصًا بڑی داد دینے لگے۔ میں نے کہا کہ یہ تو اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اور برسوں پہلے آپ کو پیش ہو چکی تھی۔ فرمایا اس وقت تو نظر کچھ سرسری ہی ڈالی ہوگی۔ لیکن ادھر بعض تازہ خلجانوں میں پڑ کر از سر نو غور سے پڑھی تو بہت زیادہ قدر ہوئی اور الحمد للہ کوئی خلش باقی نہیں رہی۔ مجھ کو کم ہی کسی کی طویل و عریض داد و تحسین سے اتنی خوشی ہوئی ہوگی جتنی ان کے گنتی کے ان چند لفظوں سے کہ تم نے پڑھا بھی خوب، حضرت کی چیزوں کو اور سمجھا بھی خوب۔

اب خوش فہمی عرض کرنے کی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات تک حضرت کے ساتھ ان کی اس عقیدت میں حصہ زیادہ کیا تمام تر اپنی سعادت کا جانتا رہا۔ لیکن ان خطوں کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ تو پیدا ہی تھانوی مزاج و مذاق لے کر ہوئے تھے اور ہمارے حضرت علی میاں سلمہٗ نے اپنے برادر معظم و مربی کے ان خطوں کی چند سطری تمہید ان کی شخصیت کا تعارف ماشاء اللہ جامعیت اعتدال و توازن فہم سلیم و رسوخ فی الدین ..... کے چند جامع الفاظ میں فرما دیا ہے۔ یہی کانٹے کی تول اعتدال و توازن علم و عمل پر مبنی ہیں۔ خاص الخاص تھانوی رنگ تھا اور یہی اسلام کی ساری ایمانی و علمی تعلیمات والی صراط مستقیم کا ہے کہا ہی کرتا ہوں کہ علوم و فنون تحقیقات و تالیفات کے دینی دفاتر ہی کا نہیں الحمد للہ ایمان و اخلاص فلاح و تقویٰ والے دینی رجال تو اس گئے گذرے زمانے میں بھی امت میں عنقا نہیں۔ عنقا جو چیز دور دور ملت میں ہر جگہ سے لگی وہ اعتدال و توازن اور فہم سلیم ہی ہے ورنہ جوش و جذباتیت افراط و تفریط تو گویا اب صراط مستقیم والی امت کی امت کا خاص مزاج و امتیاز بن گیا ہے۔ فہم سلیم نام ہی ہے دین و دنیا کی زندگی میں پیش آنے والے معاملات میں سلامتی کی راہ سمجھ اور پالینے کا

عبقری ذہن و دلوں کی ذہانت بالعموم یک رخی ہوتی ہے۔ یعنی کسی ایک طرف تو ان کا ذہن بہت زیادہ چلتا اور بہت دور تک نکل جاتا ہے۔ لیکن ایسا ذہن عملی زندگی کے لئے ناکارہ ہی نہیں خطرناک ہوتا ہے کہ اس کی یک رخی نظر ایک ہی پہلو پر زیادہ رہتی ہے۔ جس سے غلو و افراط کے مفاسد پیدا ہونا لازم ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ذہن متنوع یا بھڑکتا ہوا بالکل نہ تھا بڑا ٹھنڈا تھا۔ مجھ کو تو گوناگوں تعلقات کی بدولت آئے دن ہی اس کے تجربات ہوتے رہتے کہ ہر معاملہ کو بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچتے اور بڑی سلامتی کی رائے و مشورہ دیتے لیکن ان خطوط سے معلوم ہوا کہ ان کے اکثر فضائل و کمالات کی طرح فہم سلیم کی دولت بھی۔ دین و دنیا معاش و معاد سب کی کسبی سے زیادہ وہبی یا حضرات انبیاء علیہ السلام والے رنگ کی تھی۔ اصل یہ ہے کہ دین یا معاد کی فہم درست ہو تو دنیا یا معاش کی سمجھ آپ سے آپ درست ہونا ہی چاہئے، تابع کی درستی بڑی حد تک قدرۃً متبوع ہی کی درستی کے تابع ہوتی ہے۔

ممدوح مرحوم ابھی طالب علم ہی ہیں لیکن اس سن و سال کو دیکھئے اور معاشی و مادی فہم سلیم (جس کا کچھ ذکر اوپر بھی آچکا ہے) کے سمندر کو تین جملوں کے کوزے میں (اپنے والد ماجدؒ کے نام کے ایک طریقہ میں) کس طرح بند فرما دیتے ہیں۔ کہ طلب معاش اسی حیثیت سے ضروری ہے کہ رضا جوئی بغیر اس کے ممکن نہیں ...... اس لئے یہ اسی حد تک ضروری ہے جس حد تک رضا جوئی اسکے

بعد اگر یہ رضا جوئی بھی ممکن نہ ہو تو مباح ہے۔ اور اگر اوقات عزیز کو ضائع کرے حرج ہوگا۔

اس رضا جوئی ہی کے تحت بقدر ضرورت معاش کے انتظام کے بعد خالص رضا جوئی کے اعمال میں صوم و صلاۃ وغیرہ کی عبادات کے بعد سب سے مقدم اعلائے کلمۃ اللہ رشد و ہدایت خلق کی خالص انبیائی خدمات کو رکھا ہے اس کی لگن ان کو اس درجہ تھی کہ ابھی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی تبلیغی خدمات کا بہت محدود دائرہ سے باہر کوئی چرچا نہ تھا۔ مگر ہمارے ڈاکٹر صاحب نے غالبًا اپنی معاشی زندگی اور ندوہ کے تعلق کے اوائل میں یقینًا اس کی طرح اندر ہی اندر اس حد تک ڈال لی تھی کہ ایک دو مبلغ برابر اس کام میں لگائے رکھتے۔ خصوصًا ایسے نام کے مسلمانوں میں جن میں بہتوں کے نام بھی مسلمانوں جیسے نہ ہوتے۔ ندوہ کے مقاصد میں ابتدا ہی سے ایک شعبہ تبلیغ کا تھا مگر کاغذ سے باہر شاید ہی کوئی صورت اسکی کبھی دیکھی گئی ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اندر ہی اندر اس میں اس طرح جان ڈالی کہ مالی شرکت کی سعادت بھی خاص خاص اخلاص و اعتماد والوں ہی کو ملتی۔ ورنہ زیادہ تر یہ بھی خود ہی حاصل فرماتے۔

پھر جب بستی نظام الدین دہلی کی تبلیغی جماعت کا کام پھیلا تو ڈاکٹر صاحب کی گویا منہ مانگی مراد مل گئی اس کے سیری گشتوں میں بھی شرکت فرماتے۔ ان ہی کے طفیل میں کبھی کبھی راقم نابکار کو بھی توفیق مل جاتی۔ اور گو اپنی چشم بدبینت کی نظر میں اجتماعی رنگ کا کام کرنے والی کوئی دوسری جماعت فرنگی رنگ و روش کی نقالیوں اور ان کے مقاصد سے جماعت تبلیغی سے زیادہ پاک نہیں۔ تاہم جوش و جذباتیت میں اس کی بعض غلو پسندیاں بہت کھٹکتی رہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس خدمت و جماعت کی جیسی اہمیت و عظمت تھی۔ اس کے دیکھتے ان کے سامنے زبان پر تو آ کر رہ جاتیں۔ مسرت کے ساتھ حیرت کی حد نہ رہی۔ جب خود ان ہی کی زبان سے کسی موقع پر ان غلو پسندیوں کی ناپسندیدگی کا اظہار ہو۔ حیرت بالائے حیرت اس پر ہوتی کہ یہ بعینہٖ اسی قسم کی چیزیں تھیں۔ جن کی بدولت حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ابتداءً اس کام کی پوری سرپرستی کے باوجود کنارہ کشی فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب پر اعتدال و توازن پسندی کا خالص تھانوی رنگ زیادہ نکھر کر اس وقت سے آگیا جب حضرت تھانویؒ کا علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ میں طویل قیام ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب قریب قریب بلا ناغہ ہی حاضر ہوتے۔ پھر تو مجلس سے اٹھ کر ایسی باتوں تک کو عین عقل و نقل کے مطابق پاتے جو بہتوں کے نزدیک دونوں کے خلاف ہوتیں۔ ایک دن مجلس میں ایک پروفیسر صاحب نے کوئی ایسا بے ڈھنگا سوال کر دیا کہ حضرت کو خاصی ناگواری ہوئی۔ اور تیز لہجہ میں اس کا اظہار ہوا۔ مجلس سے اٹھ کر سوالیہ انداز میں ڈاکٹر صاحب کی طرف میں نے دیکھا لیجئے حضرت کا سب سے بدنام رنگ بھی آپ نے دیکھ لیا۔ فرمایا ایسی بے ڈھنگی باتیں ناگوار کس سلیم الفہم کو نہ ہوں گی۔ البتہ ہم مخلوق کے دباؤ میں غم کھا کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن حضرت کا ایسا مخلوق سے کمال استغناء تو اس زمانہ میں دیکھنے میں نہیں آیا پھر کیوں اصلاح و تادیب کا حق نہ ادا فرمائیں۔

اب قدر شناسانہ تھانوی فہم دین کہ وہی صراط مستقیم والا عین دین اسلام ہے۔ کا مذاق ڈاکٹر صاحب کا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ تھانوی نام و نسبت والوں میں خال خال ہی ملتا ہے۔ دخل زیادہ اس میں ان کی خداداد سلامتی فہم اور اس غیر متزلزل نیت و عزیمت کا تھا کہ جس چھوٹی بڑی بات کا بھی ان کو کتاب و سنت یا شریعت سے مطلوب و ماخوذ ہونا معلوم ہو جاتا۔ اس کے خلاف وہ قلبی ناگواری کے ہوتے ہوئے وقتی خاموشی تو اختیار فرما لیتے لیکن عمل میں اس سے دنیا کی کوئی رغبت اور دنیا والوں کی کوئی رعایت ان کو روک نہ سکتی۔

یوں بہرحال بشر ہی تھے۔ بشریت کے لوازم سے خالی کیسے رہے ہوں گے لیکن جس طرح حضرت گیلانی رحمہ کا ایمانی فراست والا قلب چند مہینوں میں اس تاثر پر مضطر ہو گیا تھا کہ ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی شاید ہی گزر پاتا ہو اس طرح اپنی آنکھوں کے شہتیر سے آنکھیں بند کر کے دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے والا یہ راقم ۴۰ سالہ قریب سے قریب اور نجی سے نجی معاملات و تعلقات پر مبنی تجربات و تاثرات پر مبنی آخر میں پھر اس شہادت پر ختم کرتا ہوں کہ نہ کبھی ان کی نگاہ قلب ایک معاملہ میں بھی دین سے ہٹتے دیکھی نہ ان کے قالب کا کوئی فعل و عمل اتفاقی طور پر بھی خلاف دین دیکھا۔ ذہن پر زور دینے پر بھی یاد آ رہا ہے تفصیل میں جاؤں تو الفرقان کا ضخیم "ڈاکٹر نمبر" بھی اس کے لئے کافی نہ ہوگا۔

"بس بزور بازو نیست" والی قلب و قالب دونوں کی اس بے داغ زندگی والی سعادت کو خدا بخشندہ کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

ان هذا الا ملك كريم - اللهم اغفرله وارفع درجاته

یہ کون کر رہا ہے؟

اس وقت جب کہ ہندوستان کے مختلف صوبے سردی کی شدید لہر سے ٹھٹھر رہے تھے۔ ٹرینوں اور جہازوں کا نظام درہم برہم تھا۔ کاروبار ٹھپ نہیں تو مدھم ضرور تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں جانوروں اور پرندوں تک کی جانیں تلف ہو چکی تھیں ٹھیک اسی وقت آسٹریلیا میں گرمی کا یہ عالم تھا کہ جنگلات میں آگ لگ گئی۔ کئی شہر خطرہ میں بتائے گئے تھے۔ یہ کون کر رہا ہے؟ گویا ایک طرف جہنم کی گرمی، دوسری طرف جہنم ہی کی سردی زمہریر ہے ہماری آج کی ترقی یافتہ دنیا ہر چیز کی تاویل کر کے چشم عبرت پر پردے ڈال دیتی ہے اس سردی گرمی سے بچاؤ، کیا کسی ایٹمی طاقت یا زیادہ سے زیادہ کا طاقت ور سے طاقت ور فوج سے ہو سکتا ہے۔؟

علمی، دینی اور عربی مطبوعات کا اہم مرکز

المكتبة الندوية

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

چند بہترین مطبوعات

تعلیم و تربیت	افضل حسین	۲۲ روپے	درِ یتیم	ماہر القادری	۳۰/- روپے
جادہ منزل	سید قطب شہید	۲۰/-	اسلام اور ضبط ولادت		۱۱/-
یہودیت و نصرانیت		۳۰/-	آداب زندگی	محمد یوسف اصلاحی	۲۴/-
اسلام میں عدل اجتماعی	سید قطب شہید	۱۶/-	حقوق الزوجین		۱۲/-
یاد رفتگاں	ماہر القادری	۲۵/-	الجہاد فی الاسلام		۵۵/-
اسلامی نظام میں عورت کا مقام	ملک خیرآبادی	۱۰/-	آفتاب عالم	حامد حسین ...	۴۰/-
اسلام اور اجتماعیت	مولانا صدر الدین اصلاحی	۹/-	ہادی عالم	محمد ولی رازی	۳۵/-

★

اس کے علاوہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، مولانا منظور نعمانی صاحب، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، مکتبہ الفرقان اور مکتبہ اسلام کی جملہ عربی، اردو، انگریزی مطبوعات ہم سے طلب کریں۔

نوٹ: پچاس روپے سے زائد کی کتاب منگانے والے حضرات قیمت پیشگی روانہ کریں تو مصارف ڈاک کی رعایت کے ساتھ کتاب رجسٹرڈ بک پیکٹ روانہ کی جائے گی۔

المكتبة الندوية پوسٹ بکس ۹۳
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷

Nadwi Book Depot. P.B. 93
DARUL ULOOM NADWATUL ULMA

گذارش

خط و کتابت نیز منی آرڈر کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں خریداری نمبر یاد نہ ہونے کی صورت میں کم سے کم جس نام سے آپ کا رسالہ جاری ہے اس کی وضاحت ضرور فرمائیں۔ (ادارہ)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

مشاہیر عرب کے خطوط

شمس الحق ندوی

مفتی محمد امین الحسینی[1]

حضرة صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل أبي الحسن علي الندوي

وكيل ندوة العلماء بالهند.

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

کل آپ کے نیازمند محمد رضوان ندوی[2] ملے اور آپ کا شاندار ہدیہ اور نئی تصنیف "مذاکرات سائح فی الشرق العربی"[3] مجھے دیا، آپ کی شکرگذاری کے ساتھ اس مبارک و گرانقدر کو شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا، آپ نے اس کتاب میں مسلمان علماء، نوجوانوں اور دینی اداروں کے ذمہ داروں کے لئے جن صحیح خیالات و ہدایات کا اظہار فرمایا ہے اور ان کو دعوۃ اسلامی کو مؤثر و فعال بنانے کے لئے خدا پر بھروسہ کرکے اور اس پر یقین رکھتے ہوئے اپنی پوری توانائیوں کو لگا دینے پر ابھارا ہے۔ اور انھیں کتاب و سنت پر عمل پیرا ہو کر صبر و ثبات کے ساتھ تقوی اور نیکی اور اس کام کے سلسلہ میں باہمی تعاون کا درس دیا ہے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی شان بڑھتی ہو، ان تمام باتوں سے بہت ہی مسرور و شاداں ہوا۔

آپ کو مومن مخلص کی شان کے مطابق مرض کی تشخیص اور اس کے لئے دوا تجویز کرنے کی سعادت و توفیق حاصل ہوئی آپ نے اپنی کتاب میں مسئلہ فلسطین پر جو تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے، جس طرح فکر و اہتمام کا اظہار فرمایا ہے اس سے خوش ہوا، فلسطین کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دینے سے اسلام اور مسلمان جس زبردست مصیبت سے دوچار ہوئے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں وہاں سے جلاوطن کر دیئے گئے ہیں اور اب اپناہ گزینی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اس صورتحال نے مسجد اقصیٰ اور اس کے ارد گرد کے مقدسات اور مبارک خطوں کو تباہی و بربادی کے خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ مسلمان اگر اپنی غفلت سے چونکے نہیں اور اپنی مسجد اور مقدس مقامات کی حفاظت کے لئے اٹھ نہیں کھڑے ہوتے اور یہودیوں کی سرکشی کو روکنے کے لئے فوجی طاقت کو بھیجنے میں جلدی نہیں کرتے تو یہ خطرہ حقیقت بن جائے گا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپکی ان کوششوں کو شرف قبولیت بخشے، اور اس کو بارآور کرے نیز امت کے اندر آپ جیسے مخلص اور کارکن علماء کی تعداد کو بڑھائے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے

۲۰ ذی القعدہ ۱۳۷۳ھ — مفتی فلسطین

۲۷ جولائی ۱۹۵۴ء — محمد امین الحسینی

بقیہ صـ کا — ازبکستان ....

کہ رابطہ سودیت یونین کے مسلمانوں کو ایک جدید طباعتی پریس ایک ملین قرآن مجید کے نسخے اور مذہبی نصابی کتابیں بطور تحفہ دے گا۔ پچھلے چند برسوں میں مسلم تنظیموں نے خیراتی سرگرمیوں میں دل کھول کر حصہ لیا ہے، چنانچہ "لینن چلڈرن فاؤنڈیشن" "دی فنڈ آف چیریٹی اینڈ ہیلتھ" اور "دی سوسائٹی فار دی پروٹکشن آف مونومنٹ آف ہسٹری اینڈ کلچر" وغیرہ تنظیموں کو زبردست چندہ دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ملک کی قدیم عمارتیں کی مرمت وغیرہ کے کام میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔

ازبکستان میں مذہب پسند عوام میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے معتقدین بھی ہیں مثلاً روسی آرتھوڈکس کیتھولک، باپٹسٹ اور یہودیوں کے کچھ فرقے یہ سارے فرقے اپنے الگ چرچ مندر اور عبادت گاہیں رکھتے ہیں۔ اور

اپنی مذہبی تقریبات مناتے ہیں۔

روسی آرتھوڈکس چرچ کے معتقدین ازبکستان میں قابل ذکر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ازبکستان کے روسی آرتھوڈکس چرچ کا انتظام چلانے والے پادری کی رہائش گاہ تاشقند میں ہوتی ہے اس ادارے کے صدر، تاشقند اور مرکزی ایشیا کے بشپ لیو کے کہنے کے مطابق، گذشتہ چند سالوں میں معتقدین اور مذہبی رہنماؤں کی پوزیشن میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور وہ اب اپنے آپ کو مکمل مامون شہری محسوس کر رہے ہیں

مذہب، اس کی تاریخ اور عوام کی اخلاقی تعلیم میں اس کے کردار پر آئے دن سودیت یونین کے جرائد میں مضامین شائع ہو رہے ہیں۔

نابغۂ عصر مولانا نسیم احمد فریدی علیہ الرحمہ کی تین نئی تصانیف

قافلۂ اہل دل

مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ و جانشین حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ، اپنے ملفوظات و مکتوبات کے آئینہ میں اور ان کے خلفاء کا تذکرہ۔ قیمت: ۲۵/ روپے

تذکرہ حضرت شاہ ابوسعید حسنی

اور سلسلۂ ولی اللہی کا ایک گمنام درویش

حضرت شاہ ابوسعید قطبی رائے بریلویؒ کے مختصر حالات۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے تعلقات۔ مراسلات کی روشنی میں۔ ساتھ ہی ان کے ایک گمنام خلیفہ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر خالصپوری کا تذکرہ۔ قیمت: ۱۰/ روپے

تذکرہ حضرت شاہ عبدالرحیم و ابوالرضا دہلویؒ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ اور عم مکرم حضرت شاہ ابوالرضا فاروقی دہلویؒ کے حالات و ملفوظات اور مکتوبات کا انمول مجموعہ۔ قیمت: ۱۴/ روپے

مولانا مرحوم کی دوسری اہم تصانیف

تجلیات ربانی — تلخیص و ترجمہ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ مکمل ۲ جلدیں ۵۵/

تذکرہ خواجہ باقی باللہ مع خلفاء و صاحبزادگان ۱۲/

تذکرہ شاہ اسماعیل شہید ۵/

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ ۳/

ملنے کا پتہ

الفرقان بکڈپو۔ ۳۱ نیا گاؤں (مغربی) نظیر آباد۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

حواشی: [1] فلسطین کے مفتی اعظم جناب مفتی امین الحسینی صاحب جو مسئلہ بیت المقدس کے روح رواں اور وہ سردار تھے، وہ فلسطین میں حسینی نام کے معروف خاندان سے تھے۔ علامہ رشید رضا مصری کے شاگرد تھے، ترک فوج میں رہ کر فوجی تربیت حاصل کی تھی۔ اور فلسطین کے مفتی اعظم ہو گئے تھے برطانوی غلامی کے دور میں جب وقت فلسطین کو یہودیوں کا وطن قرار دینے کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے فلسطین کے مسئلہ کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور اس کے لئے اپنی ساری کوشش صرف کر دی بعد میں ہجرت پر مجبور رہے ہوئے لیکن تادم آخر اس مسئلہ پر لڑتے رہے، وہ مسئلہ فلسطین کے وفادار و سردار تھے اور ان کے ساتھ کام کرنے والے اور واقف لوگ گواہ ہیں کہ انھوں نے اس مسئلہ سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس سے ان کا دامن بالکل پاک رہا۔ ان کے ساتھی ان کے اخلاص اور عقیدہ کی پختگی کے شاہد ہیں۔ مصر کے سابق وزیر اوقاف محمد علی علوبہ پاشا کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کیا تھا دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی آئے تھے۔ تقریر بھی فرمائی تھی یہ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کا قصہ ہے حضرت مولانا کا ان سے ایسا ہی تعلق تھا جیسا کہ ایک عمر دراز قائد و لیڈر اور اس کے مرتبہ شناس و قدرداں خورد میں ہوتا ہے مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں جاری جنگ و دفاع میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، اور سادات کرام کے اخلاق عالیہ تو ان کی سرشت میں داخل تھے۔ بیروت میں ۱۴ جمادی الآخرہ ۱۳۹۴ھ کو انتقال فرمایا۔ پرانے چراغ میں مولانا مدظلہ کا ان پر مفصل مضمون ہے۔

[2] ڈاکٹر محمد رضوان ندوی رام پوری، فاضل ندوہ اور پھر کلیۃ الشریعۃ دمشق یونیورسٹی سے فارغ ہو کر کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا اس وقت وہ محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی ریاض میں استاد ہیں۔

[3] شرق اوسط کی ڈائری۔

یہ ممکن نہ تھا کہ لکھنؤ جاکر ندوۃ العلماء میں حاضری نہ دیتا!

مولانا کوثر نیازی

یہ ممکن نہ تھا کہ لکھنؤ جاکر میں ندوۃ العلماء میں حاضری نہ دیتا اور عالم اسلام کی مایہ ناز علمی اور ادبی شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیارت نہ کرتا، مولانا جنھیں یہاں کے چھوٹے بڑے محبت سے علی میاں کہتے ہیں اپنے خانگی کام سے رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ انھیں میرے آنے کی اطلاع ملی تو از راہ شفقت واپس تشریف لے آئے ورنہ میرا ارادہ تھا کہ رائے بریلی جاکر ان کی صحبت سے شادکام ہوں گا کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مولانا اس وقت برصغیر پاک و ہند میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں کئی پہلوؤں سے اپنا ثانی نہیں رکھتے، وہ تحریر و انشا اور علم و ادب ہی کے میدان کے شہسوار نہیں، عمل اور تقوی میں بھی سلف صالحین کا نمونہ ہیں۔ جدید و قدیم دونوں نسلوں کو اپنی زبان و قلم سے متاثر کرنے کا زبردست ملکہ اللہ تعالیٰ نے انکی شخصیت میں رکھا ہے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی ان کی اہلیت، علمیت اور سیرت کے دل و جان سے گرویدہ ہیں، وہ عوامی خطیب تو نہیں ہیں مگر اپنی شیریں بیانی اور انسانی نفسیات کے مطابق اپنی علمی گفتگو کی بدولت حاضرین کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی بے مثال قدرت رکھتے ہیں۔

پچاس کے عشرے میں لاہور کے سعدی پارک کی جامع مسجد میں ان کا ایک خطبہ جمعہ آج تک میرے دل پر نقش ہے میں ان دنوں خود لاہور میں خطبہ جمعہ دیا کرتا تھا مگر حضرت مولانا کے خطاب کا سن کر میں اس دن اپنی مسجد سے ناغہ کرکے سعدی پارک میں حاضر ہوا، مولانا کا سراپا اتنا دل آویز ہے کہ ان کی شان محبوبیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا، صاف ستھرا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ سعدی پارک کے قریب ہی لاہور کا سب سے بڑا اور مشہور قبرستان "میانی کا قبرستان" واقع ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا نے میانی کے قبرستان کے حوالے سے دنیائے فانی اور اسلام کی تعلیمات جاودانی کا وہ نقشہ کھینچا کہ دل آنکھوں کی راہ سے باہر آنا چاہتا تھا، دوبارہ زیارت ایک حج کے موقع پر جدہ میں ہوئی جہاں میں وزیر مذہبی امور کی حیثیت سے پاکستان حج وفد کے سربراہ کے طور پر مقیم تھا انھیں معلوم ہوا تو ادارہ "تحقیقات اسلامی" اسلام آباد سے وابستہ کسی علمی کام سے مجھ سے ملنے کے لئے آنا چاہا میں نے گوارہ نہ کیا کہ وہ تشریف لائیں میں نے خود انکی قیام گاہ پر حاضری دی اتنی چھوٹی سی بات کہ وہ آج تک نہیں بھولے۔ پاکستان میں ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تو بطور خاص اس کا ذکر فرمایا اور اب لکھنؤ خدمت عالی میں پہنچا تو پھر حاضرین کے سامنے یہ واقعہ دہرا کر میری عزت افزائی کی۔ دنیائے عرب میں حضرت مولانا کی جتنی قدر و منزلت ہے وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔ عربی زبان کے ماہر اور صاحب طرز ادیب ہونے کی وجہ سے عرب ملکوں کے علمی اور ادبی حلقے انھیں بہت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور اس بات پر کم و بیش سب کا اتفاق ہے کہ عربی زبان کے زندہ اہل قلم میں انھیں امامت کا مقام حاصل ہے علمائے کرام میں مولانا کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ اور اس رشتے سے شعر اقبال اور فکر اقبال، دونوں کے زبردست مداح ہیں۔ عربی زبان میں اقبال پر ان کی کتاب "روائع اقبال" نے عرب ملکوں میں اقبال شناسی کی نئی جہتیں کھولی ہیں۔ "نقوش اقبال" کے نام سے اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اقبالیات کے موضوع پر اردو لٹریچر میں بھی یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے شعر و ادب اور امور دین سے ان کی کتابیں مالا مال ہیں "تاریخ دعوت و عزیمت" کے نام سے اب تک شائع ہونے والی پانچ جلدوں میں انھوں نے صوفیائے عظام اور اولیائے کرام کی پاکیزہ زندگی ان کی تعلیمات اور عظیم جد و جہد پر لاجواب تذکرہ قلم بند کیا ہے ہمارے پورے دینی لٹریچر میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔

مولانا جماعت اسلامی کے بانی ارکین میں شامل تھے لیکن بعد میں حضرت مولانا مودودی سے بعض اختلافات کی بنا پر جماعت سے مستعفی ہو گئے اس کے بعد سے تبلیغی جماعت کا ساتھ دیتے ہیں، مگر تبلیغی جماعت کے کارکن سے اس معاملہ میں پھر جداگانہ انداز رکھتے ہیں کہ ملکی سیاست سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود ملت کے اجتماعی مسائل کی عقدہ کشائی کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہتے ہیں۔ گذشتہ دنوں بھارت میں مسلم پرسنل لا کو خطرات لاحق ہوئے تو آپ کی سربراہی میں ہندوستان کے علماء اور مسلم تنظیموں نے بڑی کامیاب جد و جہد کی ہندو مسلم فسادات کی آگ بجھانے کے لئے بھی آپ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرکے ہندو مسلم مشترک اجتماعات سے آپکے خطبات نے ہمیشہ اس سلسلے میں بڑے اثرانگیز نتائج پیدا کیے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت میں کئی بار پاکستان تشریف لا چکے ہیں۔ مرحوم کو ان سے بڑی عقیدت تھی پہلی مرتبہ کسی نجی سفر پر مولانا کی آمد کی خبر سنی تو خصوصی طیارے سے خود کراچی پہنچے اور انکی خدمت میں حاضری دی حضرت مولانا بھی ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کیلئے ہمیشہ کلمۂ خیر کہتے تھے، صدر صاحب کے عہد حکومت کے بارے میں ان کے بعض ارشادات سے ہم ایسے نیازمندوں کو اختلاف بھی تھا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ مولانا کے خیالات کسی مفاد یا تملق کے بجائے سراسر خلوص نیت پر مبنی ہیں، جنرل ضیاء الحق مرحوم کی وفات پر انھوں نے جو دل گداز مضمون لکھا ہے وہ بھی ان کے اسی محبت بھرے احساسات کا آئینہ دار ہے۔

ندوۃ العلماء کا دارالعلوم ایک زمانے میں شہر کے باہر تھا مگر اب لکھنؤ کی آبادی پھیل جانے کی وجہ سے شہر کی وسعتوں میں سمٹ آیا ہے پھر بھی اس کے اندر جاکر احساس ہوا جیسے کسی نئی بستی میں نکل آئے ہیں۔ درس و تدریس کے کمروں، دارالاقامہ (ہوسٹل) کی تعمیرات، لائبریری، خوبصورت مسجد، ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام کے دفاتر، اساتذہ کی قیام گاہوں اور مہمان خانہ کی توسیع پر کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا یہ خوبصورت مدرسہ فکر ہی کی غذا فراہم نہیں کرتا نظر کو بھی جلا بخشتا ہے عصر کی نماز ہو رہی تھی، مولانا مسجد تشریف لے جا چکے تھے، میں بھی نماز کی ادائیگی کیلئے مسجد میں صف آخر میں کھڑا ہو گیا، مسجد کا ہال بہت بڑا تھا، لیکن پورا ہال نمازیوں سے بھر چکا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب دارالعلوم کے طلبہ و اساتذہ تھے، صاف ستھرے کپڑے پہنے اجلی اجلی سفید دو پلی ٹوپیوں میں ملبوس یہ کسی آسمانی مخلوق کا اجتماع لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر یونس نگرامی میرے ساتھ تھے، نماز کے بعد ہم مہمان خانہ کے باہر رکھی ہوئی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے، مولانا کا قیام بھی یہیں ہے تھوڑی دیر میں مولانا بھی تشریف لے آئے وہی نورانی سراپا، اچکن اور پاجامے میں ملبوس ایسے لگا جیسے ذوق نفاست انسانی مجسم میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، معانقے کے بعد بار بار فرمایا آپ مہمان تھے۔ "آپکی خدمت میں آنا تو مجھے چاہئے تھا" پھر پہلی دو ملاقاتوں کا تذکرہ فرمایا۔ طبیعت علیل تھی مگر اس کے باوجود کسی اور کو ہمارے ساتھ بھیجنے کے بجائے دارالعلوم دکھانے کیلئے ہمیں خود ساتھ لے چلے گاڑی جہاں جہاں سے گذرتی تھی وہاں کی تاریخی اہمیت بتاتے جاتے ندوہ کا فراخ ہال بطور خاص دکھایا۔ فرمایا: یہاں علامہ رشید رضا مصری نے بڑا فاضلانہ خطاب فرمایا تھا، مولانا شبلی نعمانی از راہ کرم تھے کہ اس تقریر کی اردو میں بھی ترجمانی ہو، مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر اس وقت بیس سال کی ہوگی وہ ترجمہ کرنے کھڑے ہوئے تو ان کے ترجمہ کی اثر آفرینی میں لوگ ایسے کھوئے کہ اصل تقریر کا تاثر ہی بھول گئے۔ ہال میں آویزاں چارٹ خاص طور پر دامن دل کو کھینچ رہے تھے ان کے ذریعہ مختلف علوم و فنون میں ہندوستانی علماء کا مقام واضح کیا گیا تھا۔ علم فقہ میں حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ اور علم تفسیر میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور استاذ محترم مولانا امین احسن اصلاحی کے نام دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، ورنہ فرقہ داریت اور تحزب کے اس دور میں اپنے حلقے سے باہر کون کسی کا اعتراف کرتا ہے۔

ندوہ کی لائبریری بھی قابل دید ہے اس میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ پانچ ہزار تو مخطوطات ہی ہوں گے، مولانا ایک ایک الماری کے قریب جاکر اور خاص خاص قلمی نسخے دکھا کر کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اس بات کا انھیں قلق تھا کہ پاکستان میں چھپنے والی بہت کم کتابیں یہاں موجود ہیں۔ فرمایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف اسلامی کی چند ابتدائی جلدیں، میں پاکستان سے ہمراہ لایا تھا۔ مگر بعد میں چھپنے والی جلدوں سے ہماری لائبریری محروم ہے۔

ہال اور لائبریری دونوں جگہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا ہے۔ مولانا کی صحت ابھی انہیں نقل و حرکت کی بھی کم ہی دو ہے۔ مگر مہمان کے اکرام میں انھوں نے یہ صعوبتیں بھی برداشت کیں لائبریری پہنچے تو لائبریرین سے بتایا کہ مولانا یہاں بہت لمبے عرصے کے بعد تشریف لائے ہیں

(باقی صـ پر)

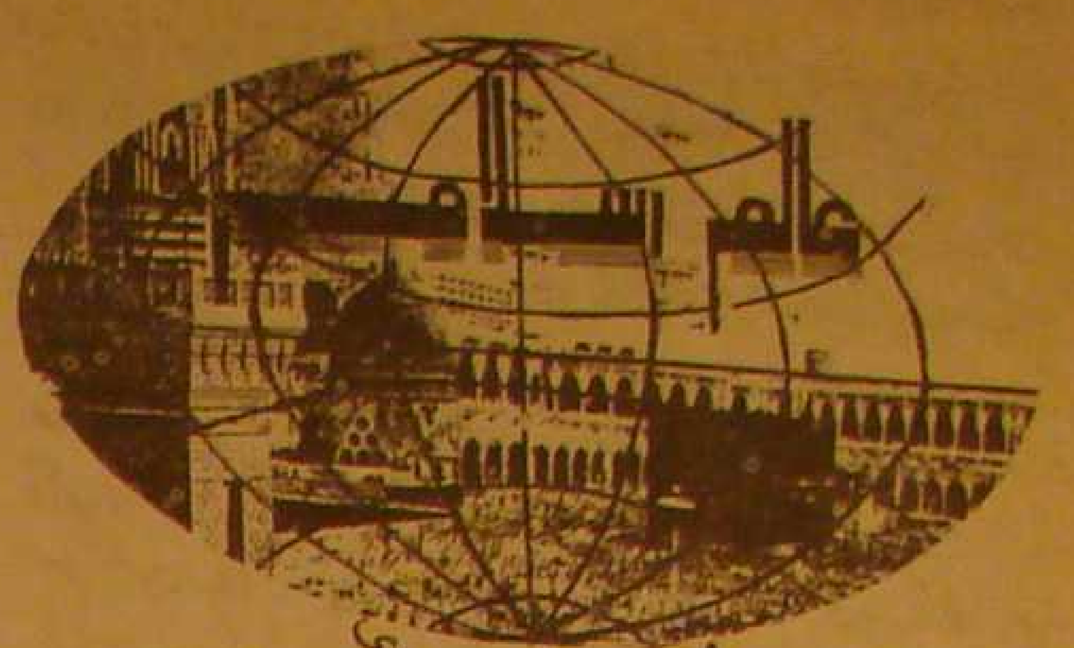

محمود الازہار ندوی

فلسطینیوں کا جہاد "انتفاضہ" تیسرے سال میں

تین سال تک اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں ۸ دسمبر کی کوئی اہمیت نہیں تھی، لیکن اب اسے فلسطینی تاریخ میں ایک ایسے دن اور ایک ایسے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، جس نے اس علاقہ کی صورتحال بدل کر رکھ دی ہے۔ اور شاید آنے والے برسوں میں وہاں کی تاریخ اور جغرافیہ کو بھی بدل کر رکھ دیں گے۔ ۸ دسمبر ۱۹۸۷ء کو غزہ پٹی میں ایک اسرائیلی فوجی ٹرک کی ٹکر سے چار فلسطینیوں کی ہلاکت کے ساتھ اسرائیلی ظلم و جبر اور تسلط کے خلاف جو جہاد "انتفاضہ" شروع ہوا، اس نے صرف یہ کہ ان علاقوں پر اسرائیلی گرفت ڈھیلی کر کے رکھ دی ہے اور عالمی رائے عامہ پھر ایک بار اس مسئلہ پر توجہ دینے پر مجبور ہو گئی ہے، اور اقوام متحدہ کے ایجنڈہ میں یہ مسئلہ سرفہرست آگیا۔ مسلح اسرائیلی فوج سے چھوٹے چھوٹے فلسطینی بچوں اور جوانوں کی اس ٹکر نے ساری دنیا کو حیران کر کے رکھ دیا ہے، ان دو برسوں میں اسرائیل کی جتنی بدنامی ہوئی ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہیں ہوئی، کیونکہ اب اس نے نہتے اور پرامن احتجاجیوں پر گولیاں برسائی تھیں اور ہر طرح کے ظلم ان پر ڈھائے تھے، جس کے نتیجہ میں گذشتہ دو برسوں کے دوران سات سو فلسطینی مارے گئے جن میں اکثریت سولہ سال سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی تھی۔ ہزاروں فلسطینیوں کو زخمی کر دیا، ان میں اکثر کو گولی لگی، اور باقی کو فوج نے بے دردی کے ساتھ زد و کوب کر کے ان کے ہاتھوں اور پیروں کی ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ اور ہزاروں فلسطینیوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اور جو بہت سخت جان نکلے انھیں ملک بدر کر دیا گیا، اسرائیلی مظالم کا یہ حال امریکی خاندانوں نے اپنے گھروں میں بیٹھ کر ٹی وی سیٹوں پر دیکھا تو ان کی چیخیں نکل گئیں اور امریکی رائے عامہ کے دباؤ میں آکر امریکی حکومت نے پہلی مرتبہ اسرائیل کی مذمت کی۔

انتفاضہ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر پیش آنے والے واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ اسرائیلی فوج کی زیادتیاں فلسطینیوں کے عزم و حوصلہ کو توڑنے میں ناکام رہی ہیں۔

اس احتجاج کے کئی منفرد اور دلچسپ پہلو ہیں سب سے پہلے تو یہ کہ اس میں فلسطینی کسی پر حملہ نہیں کرتے، ان کا اصل ہتھیار مظاہرے کرنا اور اسرائیلی تسلط کیخلاف آواز لگانا ہے لیکن جب اسرائیلی فوج انکے خلاف کاروائی کرتی ہے تو وہ اس پر پتھر پھینکتے ہیں پتھر ان کا سب سے بڑا ہتھیار بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس نے اسرائیلی فوج کو سخت پریشان کر کے رکھ دیا ہے، اور اس کا کوئی حل وہ اب تک نہیں نکال سکی ہے۔ فلسطینیوں کا دوسرا ہتھیار اسرائیلی حکام سے عدم تعاون ہے جس کے تحت وہ اکثر اپنی دکانیں بند رکھتے ہیں عام ہڑتال کرتے ہیں اور ٹیکس دینے سے انکار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اسی علاقہ میں اسرائیل کی انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی ہے اسرائیل نے عضبناک ہو کر اپنی فوج کے ذریعہ فلسطینیوں کے گاؤں کو تباہ و برباد کر دیا اور انھیں کھانے پینے کی اشیاء اور پینے کے پانی تک کی فراہمی رکوا دی۔

اس تحریک کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تحریک مسجد سے چل رہی ہے، اور اس کی بنیاد اسلام ہے۔ انتفاضہ کے ایک اہم لیڈر کے الفاظ میں اب تک جتنی تحریکیں چلیں سب اسلام سے دور تھیں، کسی نے زمین کے لئے جد و جہد کی اور کسی نے قومیت کے نام پر جد و جہد کی۔

ہمارے نوجوان اب مسجدوں کی طرف لوٹ رہا ہے اور مسجدوں سے تحریک چل رہی ہے، اسرائیل اس سے اتنا خوف زدہ ہو گیا ہے، ان نوجوانوں کی تنظیم کا نام "الحماس" ہے اور اس کی قیادت شیخ یٰسین کر رہے ہیں جو ایک بزرگ، مفلوج عالم دین ہیں، اور اب اسرائیلی جیلوں میں ہیں۔

بلغاریائی مسلمانوں کے مذہبی حقوق واپس کر دیئے گئے

بلغاریہ کی نئی حکومت نے ترکی نسل مقامی آبادی کو ان کے مذہبی حقوق دے کر ان کو اپنے مسلم نام رکھنے کی اجازت دیدی ہے۔ سابق معزول حکمراں ٹوڈر ژیکوف کے دور میں مسلمانوں پر یہ پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں کہ وہ اپنے مسلمان نام نہیں رکھ سکتے ہیں نہ ان کو عبادات کی آزادی تھی اور وہ ترک وطن پر مجبور ہو گئے تھے۔ ترکی النسل مسلمانوں کی تعداد ۱۵ لاکھ ہے اور ۲ لاکھ بلغاریائی نسل کے مسلمان ہیں۔

انتفاضہ کی وجہ سے اسرائیلی معیشت کو خسارہ:

اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں میں گذشتہ دو برسوں سے جاری فلسطینی تحریک احتجاج (انتفاضہ) کے نتیجہ میں اسرائیلی معیشت کو ایک ارب ڈالر کا خسارہ ہوا ہے۔ اسرائیل کے بایو اسنیم بنک نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ فلسطینی احتجاج کے مسلسل جاری رہنے کی وجہ سے اسرائیلی فوج کی زائد تیاریوں اور حفاظتی انتظامات کے لئے حکومت کو تقریباً ۱۶ کروڑ ڈالر کا سالانہ بوجھ مقررہ بجٹ کے علاوہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، معیشت کے خسارہ کا بڑا سبب مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ ہے۔

افغانستان میں پارلیمانی انتخابات کا اعلان

افغان مجاہدین کی عبوری حکومت نے پارلیمنٹ کے انتخابات کا اعلان کیا ہے۔ انتخابات کا یہ اعلان افغان عبوری حکومت کے وزیر انصاف اور الیکشن کمیشن کے سربراہ پیر سید احمد گیلانی نے کیا ہے انھوں نے کہا کہ افغان عبوری حکومت کی میعاد ختم ہونے سے پہلے افغانستان میں عام انتخابات کرائے جائیں گے، یاد رہے کہ افغان عبوری حکومت کی میعاد آئندہ برس اپریل ختم ہو رہی ہے۔ عام انتخابات کے لئے الیکشن کمیشن کی مرتب کردہ تجاویز اور طریقہ کار کی منظوری عبوری حکومت کی طرف سے دی جائے گی اس منتخب شوریٰ میں پانچ سو نمائندے ہوں گے، یہ امر باعث اطمینان ہے کہ انتخابات کے سلسلہ میں تمام افغان جماعتوں نے آمادگی ظاہر کر دی ہے، اور کسی کی جانب سے انہیں رکاوٹ ڈالے جانے کی کوئی امید نہیں ہے یہ انتخابات آزادانہ ہوں گے، اور ۲۰ سال سے زیادہ عمر کا ہر افغان شہری ان میں امیدوار بن سکے گا۔ جب کہ سولہ برس کا شخص ووٹر بن سکے گا۔

عام انتخابات کے طریقہ کار کی تفصیلات کے مطابق پاکستان اور ایران کے مہاجر کیمپوں میں انتخابات ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر ہوں گے۔ تاہم قبائلی علاقوں میں مروجہ روایات کے مطابق قبائلی اپنے نمائندے منتخب کریں گے اور افغانستان کے آزاد علاقوں میں وہاں کی مجالس شوریٰ اور سات جماعتی اتحاد کے کمانڈروں کے انتخابی مشورے سے انتخابی طریقہ کار وضع کیا جائے گا۔

عراق کو یورینیم پیدا کرنے کے لئے اہم ترین تکنیکی تعاون

نیوکلیائی بم بنانے میں استعمال کی جانے والی صاف کی گئی یورینیم کے لئے ایک دفاعی مرکز بنانے کے لئے چین عراق کو اہم ترین تکنیکی تعاون دے رہا ہے۔

چین کے تعاون سے دفاعی مرکز کو مستحکم بنانے والے مصنوعی اور سخت ترین مقناطیس بنانے کا کام کیا جا رہا ہے۔ لندن اور واشنگٹن کے فائنیل ٹائمس نامی اخبار نے مشرق وسطیٰ کی بازاری رپورٹ کے حوالے سے یہ جانکاری دی ہے یہ وہی مقناطیس ہیں جو چین نے پاکستان کو کہوٹہ نیوکلیائی سنٹر کو دیئے ہیں۔ جہاں بم بنانے کے لائق یورینیم تیار کی جاتی ہے۔

فرانس کے تعاون سے بنایا گیا عراق کا پہلا ایٹمی پلانٹ آٹھ سال پہلے اسرائیل نے بمباری کر کے تباہ کر دیا تھا۔

مشرق وسطیٰ کے بازار میں مغربی اخبار کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ عراق اور یورپ کی دیگر کمپنیوں کا ایک گروپ عراق کے اٹمی پروجیکٹ کی حفاظت کے لئے آلات اور تکنیکی مہارت پیدا کر رہے ہیں۔ جن میں کچھ ایسے بھی ساز و سامان ہیں جو ایٹم بم بنانے کے لئے یورینیم صاف کرنے کے لئے ضروری ہے جبکہ دیگر ساز و سامان کا تعلق بم کی ڈیزائننگ کرنے اور بم بنانے سے ہے۔

رپورٹ کے مطابق عراق نے جنوبی بغداد میں واقع ایک صنعتی کمپلیکس میں یورینیم کی صفائی کی کوششیں کی تھیں۔

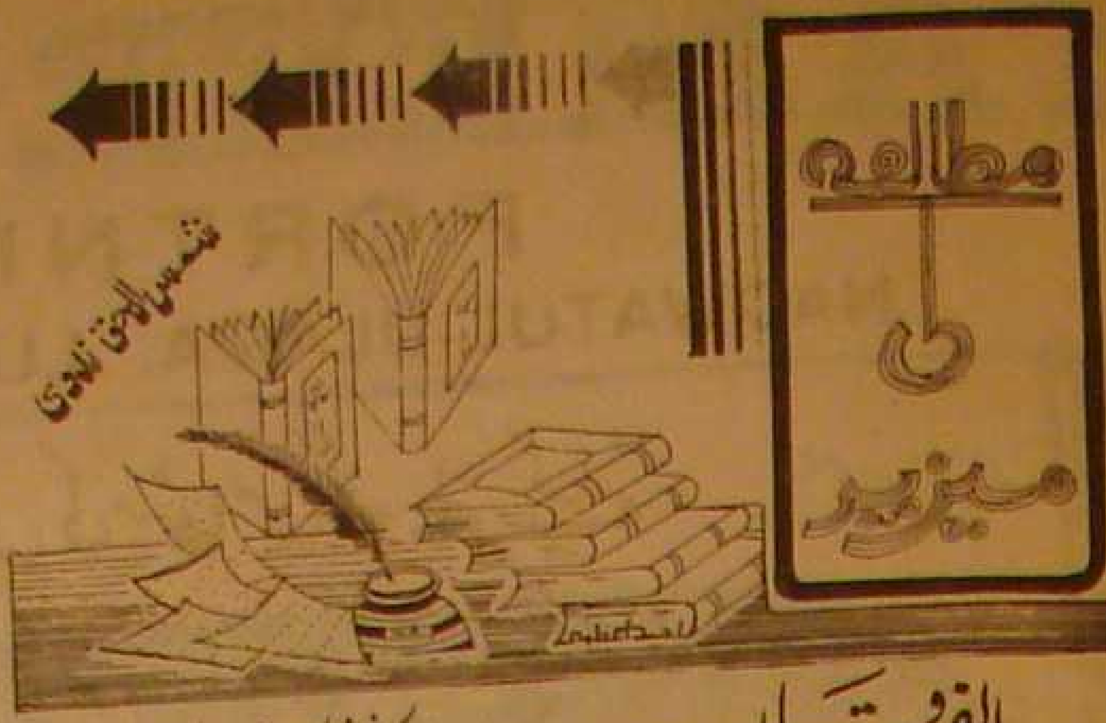

الفرقان

"حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی نمبر"

الفرقان نمبر، سائز ۲۲×۱۸ قیمت ۔/۱۵

رسالہ الفرقان کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ وہ اہل علم و اہل دل خدا رسیدہ و برگزیدہ شخصیات پر نمبر شائع کرتا رہا ہے جس سے ہزاروں بندگان خدا کو نفع پہنچا ہے اور انشاء اللہ پہنچا رہے گا اسی طرح ایک خصوصی نمبر مولانا نسیم احمد فریدی پر شائع کر کے الفرقان نے بڑی گراں قدر خدمت انجام دی ہے، مولانا مرحوم اتنے سادگی پسند، متواضع، منکسر المزاج اور ہر قسم کے تکلف سے بے نیاز تھے، کہ اپنی علمی جلالت شان اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل ہونے کے باوجود اتنے نہ پہچانے جا سکے جتنا پہچانا جانا چاہیے تھا۔ راقم سطور کو یہ شرف حاصل ہے کہ دارالعلوم کے آخری سند کی کل جو مقالہ عربی میں لکھنا تھا اس کے مشرف و مشیر مولانا مرحوم ہی تھے۔ مقالہ کا موضوع مولانا عبدالحق محدث دہلوی تھا، لیکن مولانا جس بلند مقام پر تھے اس کا ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ الفرقان خاص نمبر پڑھنے کے بعد آنکھیں کھل گئیں، جس وقت میں اس خاص نمبر کو پڑھ رہا تھا بار بار خیال آتا تھا کہ مدارس عربیہ کے طلبہ و اساتذہ کو بالخصوص اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ اس سے غیر معمولی غذا ملے گی، کیا غذا ملے گی؟ اس کا تعلق اس نمبر کے پڑھنے سے ہے میرا کوتاہ قلم اس کی سچی تصویر کشی کرنے سے قاصر ہے بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ: گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

رسالہ کے مطالعہ کے بعد بعض حضرات کو جن کی عمر بزرگوں کی خدمت میں گذری ہے یہ کہتے سنا کہ زندگی میں تو پہچان ہی نہ پائے۔ کاش! زندگی میں ان کی اس بلند مقامی کا علم ہوا ہوتا۔

یہ خاص نمبر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، جناب خلیق احمد صاحب نظامی، پروفیسر نثار احمد صاحب فاروقی اور دیگر کئی ایسے حضرات کے مضامین پر مشتمل ہے، جنھوں نے بہت قریب سے مولانا کو دیکھا اور ان کے فیوض کا مشاہدہ کیا ہے۔

قافلۂ اہل دل

سائز ۲۲×۱۸ قیمت ۔/۱۵

حضرت شاہ غلام علی مجددی نقشبندی کے ملفوظات و مکتوبات نیز ان کے خلفاء کے تذکرہ پر مشتمل ہے، حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا مظہر جان جاناں کے بعد ان کی خانقاہ کو آباد کیا اور اس طرح کی اس کا فیض ہند و سندھ، عرب و عجم اور بخارا سے روم تک پہنچا بقول مولانا نصر اللہ خان خویشگی کہ ہفت اقلیم سے کوئی اقلیم ایسی نہیں کہ حضرت کا فیض پہنچانے والا وہاں پر موجود نہ ہو۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی نے اپنے خلیفۂ مجاز مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء سے فرمایا: "تم نے کوئی عشق کی دوکان بھی دیکھی ہے"۔ مولانا محمد علی خاموش رہے تو فرمایا: "ہم نے دو دوکانیں دیکھی ہیں ایک شاہ غلام علی صاحب کی دوسری شاہ آفاق کی"۔

ان خاصان خدا کے حالات و ملفوظات، معتقدین و مسترشدین کے نام مکتوبات پر تبصرہ کرنے کے لئے بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ: ع

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

مشک اپنی خوشبو سے مشام جاں کو خود معطر کرتی ہے اسے عطار کے کہنے اور ترغیب دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کتاب میں تزکیہ اور اصلاح نفس کے دل میں جاگزیں ہو جانے والے کیسے کیسے ملفوظات ہیں۔ ان کو پڑھ کر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ تصوف اتباع سنت و شریعت، اخلاص و تقویٰ، توکل و قناعت ایثار و قربانی اور اخلاق و عادات نبوی کو اپنے اندر جذب کر لینے کا نام ہے۔ لوگ دنیا کی بڑی مذمت کرتے ہیں لیکن حقیقت میں دنیا بہت مختصر الفاظ میں کوئی بتائے کہ کیا ہے۔ استفسار بھی بے پر نہیں ہوتا۔

حضرت شاہ غلام علی فرماتے ہیں: "جو چیز دل کو حق تعالیٰ سے غافل کرے وہی دنیا ہے"[1]۔ کتاب کے مطالعہ سے اس طرح کے بہت سے حقائق و معارف کا علم ہو گا دل کو ایک سرمست کر دینے والی روحانی کیفیت حاصل ہو گی قلب کو سرور ہی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا نور حاصل ہو گا جس کا تعلق بیان سے نہیں بلکہ حس و شعور سے ہے قلم کی رسائی وہاں مشکل ہے کہ: ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

مصور کے کیمرے نے اگر اس حسن سراپا کی تصویر لے بھی لی تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ناز و ادا کی تصویر کیونکر لے گا۔

[1] ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کا بادشاہ عالمگیر اللہ کا ولی ہو سکتا ہے، اور دونیا کی مذمت کرنے والے کتنے بزرگ درویش صورت و لوگ کیسے دنیا دار ہوتے ہیں۔

تذکرہ شاہ عبدالرحیم اور شاہ ابوالرضا صاحب

مرتبہ: مولانا نسیم احمد فریدی

۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۔/۱۲

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی یگانۂ روزگار شخصیت کی تعمیر میں علاوہ مشائخ و بزرگوں کے خود خاندانی ماحول و فضا، شیخ وجیہہ الدین فاروقی جیسے دادا اور شاہ ابوالرضا جیسے چچا، اور شاہ عبدالرحیم جیسے بزرگ باپ کے کیا اثرات پڑے ہوں گے اس کا اندازہ اس ۶۰ صفحات پر مشتمل کتابچے ہی مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ مذکورہ حضرات کے ضمن میں ان کے بعض مسترشدین کے حالات بھی آگئے ہیں۔ ان سب حضرات کی روحانیت کا کرنٹ اتنا تیز ہے کہ جو ہاتھ اس تذکرے سے مس ہو جائے وہ ایسا چپکے گا کہ ختم ہوئے بغیر ہاتھ سے الگ ہونا مشکل ہے۔ کتاب میں جو مکتوبات و ملفوظات مذکور ہیں وہ کچھ ایسی تاثیر رکھتے ہیں کہ قاری اپنے احتساب و مراقبہ پر مجبور ہو جائے، ہر طالب حق کے لئے لازم ہے کہ اس مادہ پرستی و دہریت کے دور میں ایسے خاصان خدا کے حالات سے غذا حاصل کرتا رہے۔ کتاب میں اہل قبور کی زندوں سے ہم کلامی کے بعض عجیب و غریب واقعات مذکور ہیں جن سے قاری کے ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں اسکے ازالہ کے طور پر اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لئے کتاب کے آخر میں حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا مفصل ضمیمہ ہے۔

حضرت ابوسعید حسنیؒ اور سلسلۂ ولی اللہی کا ایک گمنام درویش

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۔/۱۰

مولانا مرحوم خانوادۂ علم الہٰی کے اس درویش کا تذکرہ لکھنے بیٹھے کہ جو سلسلۂ ولی اللہی سے وابستہ تھا تو تکیہ کی روحانی فضاؤں میں ڈوب کر یاد ماضی میں مست ہو کر قلم کو اس طرح حرکت دیتے ہیں:

"یہ سئی ندی ہے مسجد کے جنوب میں بہ رہی ہے، نمایاں تو اب بھی بہت سی ہیں، مگر اس کی رونق ہی کچھ اور ہے، ہر وقت شام کے وقت اس کا سکوت گوش دل کو ایک مستقل داستان سناتا ہے صبح کے سہانے وقت میں اس کی دلآویزی اور بڑھ جاتی ہے کتنے اولیاء اللہ نے اپنے مبارک قدم سے اس کے کناروں کو سرفرازی بخشی ہوگی کتنے مجاہدین اور ذاکرین نے اس ندی کے دھکیا ہو گا، شام و سحر میں جب چڑیاں ندی کے کنارے مسجد کے بام و در پر اور درختوں کے ہرے بھرے کھیتوں پر چہچہاتی ہیں تو ایک خاص کیف حاصل ہوتا ہے، اور قلب و دماغ میں یاد ماضی کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔

۱۰۲ صفحات پر مشتمل اس مختصر سی کتاب میں حضرت شاہ ابوسعید کے مختصر حالات اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان سے خط و کتابت، عالمانہ و مرشدانہ انداز میں جو دل میں ایک روحانی کیف پیدا کرتے ہیں۔ مذکور ہیں۔ آخر میں شاہ ابوسعید کے ایک خلیفۂ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر خانقاہوی کا تذکرہ ہے۔ جو مختصر و بہت مختصر ہونے کے باوجود قاری کے دل کو اپنی کوتاہی عمل کا نادم و شرمندہ کر کے حوصلۂ عمل پیدا کرتا ہے

دعائے مغفرت

جناب ممتاز حسین صاحب رحیم آبادی (جو تعمیر حیات کے قدر داں مولوی مشتاق صاحب ندوی، استاذ دارالعلوم کے خسر تھے) کا مورخہ ۲ جنوری ۱۹۹۰ء کی درمیانی شب میں انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ قارئین تعمیر حیات سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

• دارالعلوم کے قدیم خادم علی محمد مرحوم کی بیوہ کا ۱۸ جنوری کو انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ قارئین تعمیر حیات سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔